جلد ۱۰۳ — مئی ۱۹۸۵ء — عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

موسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۳ | مئی ۱۹۸۵ء مطابق شعبان ۱۴۰۵ھ | عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زر سالانہ تیس روپے۔ فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی پبلشر نے پاک فاروقی الیوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایمان ایک بیع یا معاہدہ ہے اللہ تعالیٰ سے۔ اِس معاہدے کی بنیاد شعور و دلائل پر ہوتی ہے اور یہ کسی دباؤ کے بغیر آزادیٔ ضمیر اور اختیار کے ساتھ استوار کیا جاتا ہے۔

ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کے نتیجے میں آدمی رضا کارانہ طور پر کچھ چیزوں کو مسترد اور کچھ کو قبول کرتا ہے، کچھ کو اپنے لیے جائز اور حلال اور کچھ کو ناجائز اور حرام تسلیم کرتا ہے۔ کچھ امور کے لیے اس کی طبیعت میں رغبت اور کچھ کے لیے نفرت و کراہت کام کرنے لگتی ہے۔ بعض رابطوں کو وہ ناپسند کرتا ہے اور بعض کو پسند۔ اس کے ذہن میں ایک نیا نقطۂ نظر (OUTLOOK) اور ایک پیمانۂ اقدار کام کرنے لگتا ہے۔ اس کے ضمیر میں قوت اور بیداری پیدا ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جو ایمان کے خلاف ہو اُس پر وہ ٹوکنے لگتا ہے۔

مختلف نظریات، تحریکیں، نظام، شخصیتیں اور کردار اس کے سامنے آتے ہیں اور اُس کا ایمانی شعور اسے احساس دِلا دیتا ہے کہ تم کدھر کتنا جھکاؤ اختیار کر سکتے ہو اور کدھر نہیں — خواہشوں، جذبوں، مفاد، لذّتوں، ردّعمل لہروں کا جو ہجوم آدمی کو گھیرے رہتا ہے اس میں بھی ایمانی شعور (اور اس سے وابستہ ضابطۂ قرآن وسنت) ہی رہنمائی دیتا ہے کہ کس چیز کو کن حالات میں کتنی وقعت دی جا سکتی ہے۔ ایمان ایک مسلسل جنگ کا محرک ہے جو ایک طرف اپنے نفس کے خلاف، دوسری طرف ناسازگار ماحول کے خلاف، تیسری طرف اس ایمان سے ٹکرانے والے نظریات و افکار کے خلاف عمر بھر جاری رکھنی ہوتی ہے۔ ایمان ہی کی قوت پر اس کا دار و مدار ہے

کہ یہ جنگ جاری رہے، پُرجوش طریق سے اقدام ہو، جو زخم اور نقصانات پیش آئیں، حوصلے سے برداشت کیے جائیں، اور پسپائی --- خواہ چیونٹی کی رفتار سے ہو --- کسی حال میں قبول نہ کی جائے، اور اس جنگ کے لیے زیادہ سے زیادہ سپاہ اور زیادہ سے زیادہ وسائل اکٹھے کرنے کی مہم ساتھ ساتھ جاری رہے۔ یعنی ایمان کو انجیل کی اصطلاح میں ایک ایسا خمیر ہونا چاہیے کہ جو جہاں جہاں تک اثر کرے خمیر بناتا چلا جائے۔

ایمان اگر شعوری اور جاندار ہو تو اس کے ساتھ لازمی طور پر ایک درخشاں کردار نشوونما پاتا ہے۔ کردار بمعنی اخلاقی تصور کے، اور کردار بہ معنی ایک مستقل مجموعی رویّے کے بھی۔ یہ عمل بھی رضاکارانہ عمل ہے کہ سوچنے سے لے کر رفتار و گفتار اور مجموعی کردار تک، ہر چیز میں آدمی اپنے اُوپر پابندی عاید کر لے کہ اُسے بعض چیزوں کو کبھی اختیار نہیں کرنا ہے اور اسی طرح یہ التزام کر لے کہ فلاں فلاں ہدایات کے مطابق اپنے آپ کو چلانا ہے۔ مثلاً آپ نے طے کر لیا کہ مجھے تمام عمر جھوٹ یا وعدہ خلافی سے پرہیز کرنا ہے، مجھے حسبِ مقدرت خدا کی راہ میں انفاق کرنا ہے، مجھے خدا کے بندوں سے محبت کرتے ہوئے اُن کی خدمت کرنی ہے، مجھے کبر، ریا اور نمائش اور شہرت کے چسکوں سے بچنا ہے، مجھے صاف صاف طریق سے حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دینا ہے، مجھے منظم زندگی گزارنی ہے، مجھے جماعت کا ساتھ دینا ہے، مجھے سمع و طاعت کا حق ادا کرنا ہے، مجھے خدا و رسولؐ اور دینِ برحق کے علاوہ ہر مسلمان کی، جماعت کی اور جماعت کے اکابر کی خیر خواہی کے تقاضے بھی پورے کرنے ہیں۔ مجھے غیبت اور چغلی سے بچنا ہے، مجھے رازداریِ مجالس کا پاس کرنا ہے، مجھے لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں اور شکر رنجیاں پیدا کرنے کے بجائے اُن میں صلح و سازگاری کو بڑھانا ہے، مجھے اپنے سے بڑوں کی تعظیم کرنی ہے اور چھوٹوں اور کمزوروں کے لیے شفقت کا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے، مجھے جتھا بندیاں نہیں پیدا کرنی ہیں، مجھے کسی دوسرے کو کہنی نہیں مارنی ہے اور کسی کی ٹانگ نہیں کھینچنی ہے اور اگر کوئی شخص یا گروہ اجتماعیت سے ناجائز ذاتی فائدہ اُٹھائے تو اسے جرأت سے ٹوک

دیتا ہے۔

ایمان والے آدمی کی اولین و آخرین ترجیح اپنے مقررہ نصب العین کی خدمت ہے۔ اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس نصب العین سے محبت کرنے اور اس کی خدمت کے دلدادگان کو مغالطہ دے کر ذاتی مفاد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، وہ تحریکِ اقامتِ دین کے شجرۂ طیبہ پر نفسانیت کی بیل کو نہیں پھیلنے دے گا، وہ دین کی خدمت کی آڑ میں دنیا نہیں بنائے گا۔

ایمان والوں کا کام لہو و لعب سے دُور رہنا ہے۔ ان کو نہ صرف رقص و سرود اور فحشیات سے اور مخلوط تقاریب اور بے پردگی و بے حیائی کے تمام مظاہر سے گریز کرنا ہے۔ اور ان کے خلاف معاشرے میں محاذ پیدا کرنا ہے، بلکہ ہر وہ چیز جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہو، اس کا ترک ہی نہیں کرنا، اسے قابلِ نفرین سمجھنا ہے۔

بڑی باتیں تو بڑی باتیں، ایک سچے صاحبِ ایمان کے اندر بیٹھا ہوا خفیہ نگہدار و پاسبان تو اسے اس کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ وہ لوگوں کے سامنے تھوکے، گذرگاہ میں کوئی روڑے کنکر یا کوئی گندگی پھینکے، جمائی لے تو پورا منہ کھول دے، ڈکار لے تو کھلے منہ کے ساتھ "ہاؤ" کر کے چھینک یا کھانسی آئے تو منہ پر رومال یا ہاتھ تک نہ رکھے، کسی بھی ناگوار حرکت پر قریب کے متاثرین سے معذرت تک نہ کرے، کھانا کھائے تو ہاتھ دھونے یا بسم اللہ پڑھنے سے بے نیاز رہے، کوئی احسان کرے تو شکریہ تک ادا نہ کر سکے، غرض کہ زندگی کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تمام چھوٹے اور بڑے معاملات میں اسے ایمانی شعور اور علمِ کتاب و سنت (جس کا بقدرِ ضرورت حاصل کرنا لازم ہے) کے مطابق ایک خاص طرزِ عمل کی پابندی کرنی ہے۔ اور اس کی برعکس صورتوں سے اجتناب کرنا ہے۔

یہ سارا کچھ کسی خارجی دباؤ سے نہیں ہو سکتا، اس کے لیے داخلی دباؤ ہی کارآمد ہے۔ صرف ایمانی شعور یا شعوری ایمان کا دباؤ ۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی رویہ رضاکارانہ رویہ ہے، یعنی اپنے اوپر خود عاید کردہ دینی ضابطے اور پابندیاں —— اور پھر اُن کو دو چار دن نہیں، سال دو سال نہیں، ساری عمر نبھانا۔ حالات کی گردشیں کچھ ہی ہوا کریں، ضروریات کیسی کیسی

پیدا ہوتی رہیں، ماحول کیا کیا دباؤ ڈالتا رہے، اکثریت کی روش کیسی کیسی رغبتیں اور ترغیبیں پیدا کرے، اس سارے سیلاب پر مزاحمت کی تند و تیز موجوں کے سامنے ایک مومن صرف رضائے الٰہی اور رضائے آخرت ہی کے لیے مضبوطی سے کھڑا رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص سالہا سال کھڑا رہا لیکن ایک بار خود اس کی اپنی پست ہمتی کی وجہ سے اس کے قدم اکھڑ گئے اور مخالفانہ حالات کے دھارے میں بہہ نکلا تو اس نے تقویٰ سے حاصل کردہ کمائی پل میں ضائع کر دی، یعنی کہ ساری عمر بخیر و خوبی گزار کر موت سے کچھ ہی پہلے وہ بہک گیا تو وہ زندگی کا سارا اکاؤنٹ ختم ہو گیا۔ خدا ہر صاحبِ ایمان کو ایسے خسران سے بچائے۔

خسران سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی باقاعدگی سے اپنا احتساب خود کرتا رہے۔ ہر نماز کے بعد اور ہر دن کو ختم کرنے پر۔ وہ یہ دیکھے کہ کسی ادنیٰ رفتار سے بھی عقاید میں، عبادات میں، مقاصد میں، اخلاق میں، تحریکی جد و جہد میں، فریضہ سمع و طاعت میں، دعوتِ حق کے پھیلانے میں پسپائی تو نہیں ہو رہی؟ فخر و ریا اور شہرت طلبی اور مفاد پسندی کی منحوس پرچھائیاں تو ذہن پہ نہیں پڑ رہیں؟

خرابی جب آتی ہے تو چوروں کی طرح دم سادھے ہمارے حریمِ ذات میں داخل ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر اپنا زہر پھیلاتی ہے۔ آدمی اپنے نفس اور ماحول کے دباؤ سے بعض امور میں ہلکی ہلکی تاویلیں کرتا ہے اور انحرافی طرز اختیار کرنے کے لیے خاصے دلائل جمع کرتا ہے تاکہ اپنے ضمیر کا مقابلہ کر سکے۔ تاویلوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصول و حدود اور مقاصد و غایات اور اخلاقی شعائر کی جو لکیریں کتاب و سنت کی روشنی میں بہت سوچ سمجھ کر لگائی تھیں اور جن کی سالہا سال تک پاسداری کی ہے انھیں ذرا سا آگے پیچھے کیا جا سکے۔ بس ایک دفعہ اگر کسی گوشے میں یہ عمل کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر دوسرے گوشوں میں بھی ایسا ہونے لگتا ہے۔ پہلے اگر پسپائی یا انحراف کا عمل اِنچ کے دسویں حصے تک محدود تھا تو کسی دوسرے مرحلے میں پورے اِنچ کا فرق پڑ جاتا ہے اور بعد ازاں کسی اور موقع پر فٹ بھر کا، اور آگے چل کر میل بھر کا۔

تاریخ میں انسانی کردار کے لیے سنتہ اللہ یہی ہے کہ جو تھوڑا سا آگے بڑھنے کے لیے زور لگاتا ہے، اسے زیادہ پیش قدمی کے لیے حالات مہیا کیے جاتے ہیں، اسی طرح جو قدم کو پیچھے ہٹاتا ہے اُس کو مزید پیچھے ہٹانے والے حالات پیش آتے ہیں۔ (نولہٖ ما تولّٰی)

اس خطرے سے تحفظ صرف احتساب میں ہے۔ احتساب کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے اوّلین طے کردہ خطوط و حدود کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے اور پھر دیکھنا چاہیے کہ ان خطوط حدود میں کیا تبدیلی کی گئی۔ یوں بھی سوچا جا سکتا ہے کہ کل تک کسی معاملے کے التزام یا کسی غلط چیز سے اجتناب کے بارے میں ایک شخص (یا سارا گروہ) کہاں قدم جمائے ہوئے تھا اور آج کہاں ہے!

سامنے رمضان کا مہینہ ہے جو ماہ صبر و تقویٰ ہونے کے علاوہ احتساب کا بھی خاص مہینہ ہے روزے کی حالت میں، نمازوں میں، تراویح میں، سحری کے وقت، زیادہ مبارک گھڑیاں ایسی نصیب ہو سکتی ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص اپنا ایمانی احتساب کرے کہ رضا کارانہ طور پر جن ذمہ داریوں کو اُٹھایا تھا اُن میں کوئی فرق تو نہیں آگیا؟ اور یہ فرق محسوس ہو تو خدا سے مدد کی درخواست کے ساتھ اپنے ایمانی مرتبے کو بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی پر تحریک اقامتِ دین کی کامیابی کا انحصار ہے۔

ایک ضروری تصحیح

مجھے سخت افسوس ہے کہ سابق شمارے میں ایک آیتِ قرآنی صحیح درج نہیں ہوئی، اب اس کی تصحیح کر لیں:

لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا علیٰ ما اٰتکم۔

(ن - ص)

حکمتِ سیّد مودُودیؒ

روزے کا اجتماعی پہلو

اخذ و اقتباس کردہ - محمد یوسف صاحب - مرکز معارف اسلامی منصورہ - لاہور

نماز کی طرح روزہ بھی بجائے خود ایک انفرادی فعل ہے لیکن جس طرح نماز کے ساتھ جماعت کی شرط لگا کر اس کو انفرادی سے اجتماعی فعل میں تبدیل کر دیا گیا ہے ۔ اسی طرح روزے کو بھی ایک ذرا سی حکیمانہ تدبیر نے انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل بنا کر اس کے فوائد و منافع کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا - وہ تدبیر بس اتنی سی ہے کہ روزے رکھنے کے لیے ایک خاص مہینہ مقرر کر دیا گیا ہے ۔

روزے کا اجتماعی پہلو اگر شارع کے پیش نظر محض افراد کی اخلاقی تربیت ہوتی تو اس کے لیے یہ حکم دینا کافی تھا کہ ہر مسلمان سال بھر کے دوران میں کبھی تیس روزے رکھ لیا کرے، اس طرح تمام مقاصد پورے ہو سکتے تھے - بلکہ ضبطِ نفس کی مشق کے لیے یہ صورت زیادہ مناسب تھی کیونکہ اجتماعی عمل سے روزہ رکھنے میں جو آسانی افراد کے لئے پیدا ہو جاتی ہے وہ انفرادی عمل کی صورت میں نہ ہوتی اور ہر شخص کو اپنا فرض ادا کرنے میں نسبتاً زیادہ شدت کے ساتھ اپنی قوتِ ارادی استعمال کرنی پڑتی - لیکن اسلام کا قانون جس حکیم نے بنایا ہے اس کی نگاہ میں افراد کی ایسی تیاری کسی کام کی نہیں ہے جس کے نتیجہ میں ایک جماعت صالحہ وجود میں نہ آئے ۔ اس لیے اس نے روزے کو محض ایک انفرادی عمل بنانا پسند نہیں کیا بلکہ سال بھر میں ایک مہینہ روزے کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ سب مسلمان بیک وقت روزہ رکھیں اور وہی نظامِ تربیت جس سے افراد تیار ہوں، ایک

صالح اجتماعی نظام بنانے میں بھی مددگار ہو جاتے۔

اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کیے جاتے ہیں۔

قبولیت کی فضا | اجتماعی عمل کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں اس کے شریک ہوں، تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پائے گا۔ اس کی کیفیت ذہنی صرف اسی کی ذات تک محدود اور صرف اسی کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی۔ اس کو نشوونما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی، بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے اُلٹا گھٹا دیں گے۔ لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو، اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی۔ اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد و حساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ایک شخص اکیلا برہنہ ہو اور گرد و پیش سب لوگ کپڑے پہنے ہوئے ہوں تو وہ کس قدر شرمائے گا، بےحیائی کی کتنی مقدار اس کو برہنہ ہونے کے لیے درکار ہوگی اور پھر بھی ماحول کے مختلف اثرات سے اس کی شدید بےحیائی بھی کس طرح بار بار شکست کھائے گی، لیکن جہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوں وہاں شرم بےحیائی کو جھجکنے کا موقع بھی نہ ملے گا اور ہر شخص کی بےشرمی دوسرے کی بےشرمی سے مدد پا کر افزوں در افزوں ہوتی چلی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور مہالکِ جنگ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ مگر جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذباتِ شہامت و حماست کا ایک طوفان اُمنڈ آتا ہے جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی دونوں کی ترقی میں اجتماعی نفسیات کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ جماعت مل کر بدی کر رہی ہو تو فحش، بےحیائی اور بدکاری کے جذبات اُبل پڑتے ہیں، اور جماعت مل کر نیکی کر رہی ہو تو پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات

کا سیلاب آجاتا ہے جس میں بد بھی نیک بن جاتے ہیں خواہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔

اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دے کر رمضان سے شارع نے یہی کام لیا ہے جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے جس میں بُرائیاں دبتی ہیں، نیکیاں پھیلتی ہیں۔ پوری پوری آبادیوں پر خوف خدا اور محبت خیر کی روح چھا جاتی ہے اور ہر طرف پرہیزگاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے۔ اس زمانہ میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے۔ ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اُسے شرم دلاتا ہے۔ ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے، کسی غریب کو کھانا کھلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے، کہیں کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اس میں حصہ لے، کہیں کوئی بدی ہو رہی ہو تو اسے روکے۔ اس وقت لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں۔ ظلم سے ہاتھ رُک جاتے ہیں، بُرائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ توبہ اور خشیت و انابت کی طرف طبیعتیں مائل ہو جاتی ہیں۔ نیک بہت نیک ہو جاتے ہیں اور بدوں کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس جلاب سے اس کا اچھا خاصا تنقیہ ضرور ہو جاتا ہے۔ غرض اسی زبردست حکیمانہ تدبیر سے شارع نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر سال ایک مہینے کے لیے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے، اس کو اودنہ ہال کیا جاتا رہے۔ اس کی نا پاکی چھانٹی جائے۔ [اور اس مجموعی حیثیت سے روحِ اسلامی کو از سرِ نو] زندہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا دخل رمضان فتحت	جب رمضان آتا ہے تو جنت کے
ابواب الجنة وغلقت	دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم
ابواب جهنم وسلسلت	کے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین باندھ
الشيطن۔	دیے جاتے ہیں۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:

اذا کان اول لیلۃ من	جب رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے تو
شھر رمضان صفدت الشیطین	شیاطین اور سرکش جن باندھ دیئے جاتے ہیں
ومردۃ الجن و غلقت ابواب	دوزخ کی طرف جانے کے دروازے بند کر دیئے جاتے
النار فلم یفتح منھا باب وفتحت	ہیں، ان میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور
ابواب الجنۃ فلم یغلق منھا	جنت کی طرف جانے والے دروازے کھول دیئے
باب وینادی مناد یا باغی	جاتے ہیں ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا
الخیر اقبل و یا باغی الشر	اس وقت پکارنے والا پکارتا ہے اے بھلائی کے
اقصر۔	طالب آگے بڑھ اور اے برائی کے خواہشمند ٹھہر جا۔

سکتہ کے مریض کا آخری امتحان اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کی ناک کے پاس آئینہ رکھتے ہیں۔ اگر آئینہ پر کچھ دھندلاہٹ سی پیدا ہو تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے۔ ورنہ اس کی زندگی کی آخری امید بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کسی بستی کا تمہیں امتحان لینا ہو تو اُسے رمضان کے زمانہ میں دیکھو۔ اگر اس مہینہ میں اس کے اندر کچھ تقویٰ، کچھ خوفِ خدا، کچھ نیکی کے جذبے کا اُبھار نظر آئے تو سمجھو ابھی زندہ ہے۔ اور اگر اس مہینہ میں بھی نیکی کا بازار سرد ہو، فسق و فجور کے آثار نمایاں ہوں، اور اسلامی حس مُردہ نظر آئے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لو۔ اس کے بعد زندگی کا کوئی سانس "مسلمان" کے لیے مقدر نہیں ہے۔

جماعتی احساس اجتماعی عمل کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ نسل یا زبان یا مرزبوم یا معاشی اغراض کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتا۔ آدمی کا دل صرف اُسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہو۔ یہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے اور جس کے ساتھ خیالات اور عمل میں اتفاق نہ ہو اُس سے کبھی دل نہیں ملتا، خواہ دونوں ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہوں۔ جب کوئی شخص اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے۔ مگر جب بہت سے

لوگ مل کر ایک ہی ذہنی کیفیت کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہم یگانگت، رفاقت، یک جہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، اُن کے درمیان کوئی اجنبیت باقی نہیں رہتی، قلب و روح کا اشتراک اور عمل کا اتفاق ان کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیتا ہے۔

خواہ نیکی ہو یا بدی، دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتے ہیں۔ چوروں میں چوری کا اشتراک اور شرابیوں میں شراب نوشی کا اشتراک بھی یونہی برادری پیدا کرتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستہ میں افراد کی نفسانیت کا دخل ہوتا ہے جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے، اس لیے ایسے راستوں میں برادری کبھی بے آلائش اور مستحکم نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے نیکی کے راستے میں نفسانیت دبتی ہے، انسانی رُوح کو حقیقی تسکین ملتی ہے، اور پاک جذبات کے ساتھ آدمی اس راستہ پر چلتا ہے، اس لیے نیک خیالات اور نیک عمل کا اشتراک وہ بہترین رشتۂ اخوت پیدا کرتا ہے جس سے زیادہ مستحکم اجتماعی رابطہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نماز باجماعت کی طرح رمضان کے اجتماعی روزے مسلمانوں میں اسی نوع کی برادری پیدا کرتے ہیں۔ تمام لوگوں کا مل کر ایک خدا کی رضا چاہنا، اسی کی رضا کے لیے بھوک پیاس کی تکلیف اُٹھانا، اسی کے خوف سے بُرائیوں کو چھوڑنا اور ایک دوسرے کو بُرائیوں سے روکنا، اسی کی محبت میں بھلائیوں کی طرف دوڑنا اور ایک دوسرے کو بھلائی پر اُکسانا، یہ چیز ان میں بہترین قسم کی وحدت، صحیح ترین فطری قومیت، پاکیزہ ترین اجتماعی ذہنیت، اور ایسی ہمدردی و رفاقت پیدا کرتی ہے جو ہر کھوٹ سے خالی ہے۔

امداد باہمی کی رُوح

اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے۔ اگرچہ امیر، امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب، لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہی کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گزرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے، اور خدا کی رضا چاہنے کا جذبہ اُسے غریب بھائیوں کی مدد کرنے پر اُکساتا ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی چھوٹی سی

بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کے اخلاقی و تمدنی فوائد بے شمار ہیں.... جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکالیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو، اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو، وہاں صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اجتماعی فلاح ترقی کرتی رہتی ہے، بلکہ غربت اور امارت میں حسد کے بجائے محبت کا، شکر گزاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ طبقاتی جنگ کبھی نشو و نما نہیں ہو سکتی جو آج قوموں میں برپا ہو رہی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے، جو قحط کے زمانہ میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوک سے کیوں مر رہے ہیں، انہیں روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

یہ اسلام کا دوسرا عملی رکن ہے جس کے ذریعہ سے اسلام اپنے افراد کو فرداً فرداً ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دے کر تیار کرتا ہے۔ اور پھر انہیں جوڑ کر ایک خاص طرز کی جماعت بناتا ہے۔ اسلام کا آخری مقصد جس مدنیتِ صالحہ اور حکومتِ الٰہیہ کو وجود میں لانا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی اسی طرح نماز اور روزے کے ذریعے سے چھیل بنا کر تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے سپاہی اور جنرل، اس کے اہل کار، عہدہ دار اور وزراء، اس کے معلم اور پروفیسر، اس کے قاضی اور مفتی، اس کے تاجر، مزدور، کارخانہ دار اور کسان، اس کے رائے دہندے، نمائندے اور شہری، سب اس تربیت کے بعد کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے اجتماع سے وہ صالح و تمدنی سیاسی نظام بن سکے جسے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ محض ان گھڑ افراد کو لے کر خلافت الٰہیہ قائم کرنے کے لیے دوڑ جانا ایسی خام خیالی و خام کاری ہے، جس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۴۰ء)

اسلامی تنظیم کی اہمیت اور اس کے تقاضے

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(۲)

تحریکِ اسلامی میں آزادیٔ رائے کا مقام مولانا مودودیؒ نے جماعت میں آزادیٔ رائے کی حفاظت اور اس کے مقام کا تذکرہ کرتے ہوئے تشکیلِ جماعت کے پہلے ہی اجلاس میں فرمایا:

"میں نہ تو یہ چاہتا ہوں کہ فقہی اور کلامی مسائل میں اپنی رائے جماعت کے دوسرے اہلِ علم و تحقیق پر مسلط کروں اور نہ اس کو پسند کرتا ہوں کہ جماعت کی طرف سے مجھ پر کوئی ایسی پابندی عائد کی جائے کہ مجھ سے علمی تحقیق اور اظہارِ رائے کی آزادی سلب ہو جائے۔ ارکانِ جماعت کو میں خداوندِ برتر کا واسطہ دے کر ہدایت کرتا ہوں کہ کوئی شخص فقہی اور کلامی مسائل میں میرے اقوال کو دوسروں کے سامنے حجت کے طور پر پیش نہ کرے۔ اسی طرح میرے ذاتی عمل کو بھی جسے میں نے اپنی تحقیق کی بنا پر اختیار کر رکھا ہے، نہ دوسرے لوگ حجت بنائیں اور نہ بلا تحقیق محض میرا عمل ہونے کی حیثیت سے اس کا اتباع کریں۔ ان معاملات میں ہر شخص کے لیے آزادی ہے۔ جو لوگ علم رکھتے ہوں وہ اپنی تحقیق پر اور جو علم نہ رکھتے ہوں —— وہ جس کے علم پر اعتماد رکھتے ہوں اس کی تحقیق پر عمل کریں۔ نیز ان معاملات میں مجھ سے اختلاف رائے رکھنے اور اپنی رائے کا اظہار کرنے میں بھی سب آزاد ہیں۔ ہم سب جزئیات و فروع میں اختلاف رائے رکھتے ہوئے اور ایک دوسرے کے بالمقابل بحث و استدلال کرتے ہوئے بھی ایک جماعت بن سکتے ہیں۔ جس طرح صحابۂ کرام رہتے تھے۔"

تنظیم میں تنقید و احتساب کا مقام اور اہتمام تنظیم کا دستور اس کی ضمانت دیتا ہے کہ

تنقید و احتساب لازم اور ضروری ہے۔ اسی سے جماعت کی اخلاقی صحت بحال رہ سکتی ہے چنانچہ دستور کی دفعہ ۲، شق ۶، ۷ میں درج ہے کہ۔

"ایک رُکن جماعت کے لیے لازم ہے کہ وہ :-

الف۔ رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے اور کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اسی معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہے اُس کو اُسی درجے میں رکھے۔

ب۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی دوسرے انسان کا یہ منصب تسلیم نہ کرے کہ اس کو ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کُفر یا ایمان کا فیصلہ ہو۔"

پھر ہدایات کے صفحہ ۳۵ پر درج ہے کہ:۔

"جماعتی زندگی کو درست رکھنے کے لیے تنقید نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی جماعت زیادہ دیر تک صحیح راستے پر گامزن نہیں رہ سکتی۔ اس تنقید سے کسی کو بھی بالاتر نہ ہونا چاہیے۔ خواہ وہ آپ کا امیر ہو یا مجلسِ شوریٰ یا پھر پوری جماعت ہو۔ میں اس کو جماعت کی صحت برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جس روز خدانخواستہ ہماری جماعت میں اس کا دروازہ بند ہوا اُسی روز ہمارے بگاڑ کا راستہ کھل جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ابتدا سے ہر اجتماع کے بعد ارکانِ جماعت کا ایک اجتماعِ خاص اس غرض کے لیے منعقد کرتا ہوں کہ اس میں جماعت کے کام اور انتظام کا پورا جائزہ لیا جائے۔ سب سے پہلے میں خود اپنے آپ کو تنقید کے لیے پیش کرتا ہوں تاکہ جس کو مجھ پر یا میرے کام پر کوئی اعتراض ہو وہ اسے سب کے سامنے بلاتکلف بیان کرے اور اس کی تنقید سے یا تو میری اصلاح ہو جائے یا میرے جواب سے اس کی اور اُس کی طرح سوچنے والے دوسرے لوگوں کی غلط فہمی رفع ہو جائے۔"

تنظیم میں مشاورت کا اہتمام | اسلامی تحریک میں مشاورت ایک شرعی ضرورت ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بانیٔ جماعت نے رُوداد جماعتِ اسلامی حصہ سوم کے صفحہ ۷۰، ۸ پر فرمایا ہے۔

"باہمی مشاورت جماعتی زندگی کی جان ہے اس کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ جس شخص کے سپرد کسی جماعتی کام کی ذمہ داری ہو اُس کے لیے لازم ہے کہ اپنے کاموں میں دوسرے رفقا

سے مشورہ لے اور جس سے مشورہ لیا جائے اُس کا فرض ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ اپنی حقیقی رائے کا صاف صاف اظہار کرے جو شخص اجتماعی مشاورت میں اپنی صواب دید کے خلاف رائے دیتا ہے وہ جماعت سے غدر کرتا ہے اور جو مشاورت کے موقع پر اپنی رائے چھپاتا ہے اور بعد میں جب اُس کی منشا کے خلاف کوئی بات طے ہو جاتی ہے تو جماعت میں بد دلی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے وہ بدترین خیانت کا مجرم ہے۔

اسلامی تحریک کے مقررین کا معیار اسلامی تنظیم اتنی نظریاتی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقررین تک کے لیے خاص انداز اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ نے معیار تقریر پر اظہار خیال کرتے ہوئے روداد جماعت اسلامی حصہ دوم صفحہ ۴۵ پر فرمایا۔

"ضروری ہے کہ ہم تقریر کا نیا ڈھنگ اختیار کریں، نمائشی اور ہنگامی اسٹیج سے دور رہیں اور ذمہ دارانہ گفتگو کی عادت ڈالیں تاکہ جو آواز بھی ہماری طرف سے بلند ہو وہ اتنی باوقعت، وزن دار اور ممتاز ہو کہ لوگ اُس کو اُن بہت سے سُروں میں سے ایک سُر نہ سمجھ لیں جو ہنگامہ پرور اور بے لگام مقررین کے سازوں سے نکل رہے ہیں۔ میں نے اب تک اپنے ان رفقاء کو تقریر سے روک رکھا ہے جن پر پُرانی عادت کا اثر اب تک باقی ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں اسی پُرانے انداز کی تقریریں ہم بھی نہ کرنے لگیں، جو نظام اسلامی کا نام لینے والوں کے منہ کو زیب نہیں دیتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ نشرِ افکار کے تمام ذرائع استعمال کریں، مگر پہلی شرط یہ ہے کہ انہیں اخلاقِ اسلامی کا پابند بنائیں اور ان غیر صالح عناصر سے انہیں پاک کریں جو شتر بے مہار قسم کے لوگوں نے ان میں ملا دیئے ہیں۔

تحریک میں جماعت کی اہمیت مولانا مودودیؒ نے اسلامی تحریک کے لیے اجتماعات کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جماعتِ اسلامی کی دعوت کے صفحہ ۷۶ پر فرمایا۔

"آپ اجتماع کے دنوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور دوسری قسم کی دلچسپیوں میں وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیں۔ ان دو تین دنوں کے لیے ایک ایک لمحے کو اپنے نصب العین کی خدمت کے لیے استعمال کیجیے۔ اجتماع کے ایام میں کسی شخص کا دوسری باتوں اور دلچسپیوں کے ساتھ کوئی دلی لگاؤ نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں آپ کی پوری جماعتی طاقت ایک

جگہ مجتمع ہے۔ اِس قیمتی موقع سے فائدہ اُٹھائیے، دُور و نزدیک کے رفقاءِ کار سے تعارف پیدا کیجیے، باہم سر جوڑ کر مشورے کیجیے، آپس میں تعاون کی تدبیریں سوچیے، ہمدردوں کے جذبۂ اخلاص و عمل کو اُبھاریئے، نئے لوگوں کو اپنی دعوت سمجھایئے۔ اور اپنی تمام فکر کو اِس سوال پر مرکوز کر دیجیے کہ ہم اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے کیا کیا تدبیریں کس کس طرح کر سکتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ اجتماعات کے لیے جب آپ نکلیں اُس وقت سے لے کر اپنے گھروں کو واپس ہونے تک اپنے آپ کو راہِ خدا میں سمجھیں اور اس دوران میں آپ کی ساری فکر، تمام توجہ اور پوری مصروفیت اس دعوتِ حق اور اس کے متعلق امور کے لیے وقف ہو۔"

پھر اپریل ۱۹۵۱ء کی مجلسِ شوریٰ میں فیصلے کیے گئے ہیں کہ:۔

"ا۔ ہفتہ وار اجتماعات میں وقت کے اہتمام کے ساتھ ارکان کی حاضری کی پابندی کی جائے۔ جو لوگ کسی اجتماع میں دیر سے آئیں یا نہ آئیں ان سے اس کی وجہ تحریری صورت میں طلب کی جائے یا زبانی معلوم کر کے حاضری کے رجسٹر میں نوٹ کی جائے۔ جو شخص بلا اجازت بغیر عذرِ شرعی مسلسل تین مرتبہ ہفتہ وار اجتماع سے غیر حاضر رہے اُسے جماعت سے اخراج کا نوٹس دیا جائے اور اس سے وجہ دریافت کی جائے کہ کیوں نہ اسے جماعت سے خارج کر دیا جائے۔"

پھر رودادِ جماعتِ اسلامی حصہ دوم صفحہ ۱۱ تا ۱۴ پر رفقاء سے خطاب کرتے ہوئے بانیٔ جماعت نے فرمایا۔

"ہمارے اجتماع کی نوعیت اصطلاحی جلسوں سے بالکل مختلف ہے۔ جلسوں اور کانفرنسوں میں زیادہ تر تقریریں ہوتی ہیں، جلوس نکلتے ہیں، نعرے بلند کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس نوعیت کی کوئی چیز یہاں نہ ہوگی۔ ہمارے ان اجتماعات کے انعقاد کی اصل غرض ہنگامہ آرائی نہیں ہے اور نہ فی الحال توجہاتِ عوام کو اپنی طرف کھینچنا مقصود ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ باہم قریب تر ہو جائیں۔ آپس میں تعاون کی سبیلیں نکالیں۔ صاحبِ امر آپ سے اور آپ صاحبِ امر سے شخصاً واقف ہوں اور اُسے آپ کی قوتوں اور صلاحیتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو تاکہ وہ آپ سے منظم کام لینے کی کوشش کرے۔ وقتاً فوقتاً ہم اپنا اور اپنے کام کا جائزہ لیتے رہیں اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو سمجھیں اور انہیں دُور

کرنے کی فکر کریں اور باہمی مشوروں سے اپنے کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں سوچیں غرض ہمارے یہ اجتماعات اپنے اندر عملی روح رکھتے ہیں۔ اِن میں عام جلسوں کی نوعیت کی کوئی چیز نہ آپ پا سکتے ہیں نہ آپ کو اسے پانے کی خواہش کرنی چاہیے۔ اگر ابھی تک جلسہ بازی کی پرانی عادتوں کا کچھ اثر آپ میں موجود ہو اور ان چیزوں کی کوئی تشنگی آپ اپنے اندر پاتے ہوں تو اسے بھی نکالنے کی کوشش کیجیے۔ ان ہنگاموں میں فی الواقع کچھ نہیں رکھا ہے۔ فضول کاموں میں ذرہ برابر وقت ضائع نہ کیجیے بس کام کی بات کیجیے اور پھر اپنا فرض ادا کرنے میں لگ جائیے"۔

تنظیم کے لیے نظم وضبط کی اہمیت

مولانا مودودیؒ بانی جماعت نے رودادِ جماعتِ اسلامی دوم صفحہ ۴۱ پر رفقاء سے خطاب کرتے ہوئے تحریک میں نظم وضبط کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"آپ اپنے تمام اجتماعی کاموں میں نظم وضبط اور سکون و وقار اور اسلام کے دوسرے اجتماعی آداب کی پوری پوری پابندی ملحوظ رکھیں۔ بلاشبہ اس معاملہ میں آپ نے پچھلے برسوں کے اندر نمایاں ترقی کی ہے جس پر میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں لیکن ابھی آپ کو اپنی بہت سی خامیوں کی تلافی کرنی ہے۔ بہت سی اجتماعی خوبیوں کو اپنے اندر پرورش کرنا ہے اور ابھی بہت فاصلے پر وہ حدِ کمال ہے جس پر آپ کو پہنچنا ہے۔ آپ اپنے مقصد کے لیے دُنیا کی جن زبردست طاقتوں کے مقابلہ میں جدوجہد کرنے اٹھے ہیں وہ آج نظم وضبط کی انتہائی حد پر پہنچی ہوئی ہیں اور ان کے مقابلہ میں آپ کا نظم ابھی کسی شمار میں آنے کے قابل نہیں ہے۔ آپ کے پیشِ نظر محض کسی ایک چھوٹے یا بڑے علاقے میں صرف انتظام کرنے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے بلکہ سرے سے اس نظام کو بدل دینا ہے جس پر نوعِ انسانی کی زندگی کا انتظام اس وقت چل رہا ہے۔ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ صحابہ کرام نے محض اپنے عقیدہ و مقصد کی پاکیزگی اور اپنے اخلاق کی فضیلت ہی سے نہیں بلکہ اپنی تنظیم سے بھی دُنیا کے ائمہ شر کو شکست دی تھی۔ اب بھی یہ انقلاب اس کے بغیر رونما نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ اس کے خواہش مند ہیں وہ اپنے آپ کو افکار، اخلاق اور انتظامی صلاحیت میں دُنیا کے موجودہ منتظمین سے فائق تر ثابت کر دیں"۔

ایک دوسرے موقع پر خطاب کرتے ہوئے مزید فرمایا:

"آپ کے اجتماعات میں خواہ کتنا ہی بڑا مجمع ہو مگر خیال رکھیے کہ بھیڑ اور ہڑبونگ اور شور و ہنگامہ کی کیفیت کبھی رُونما نہ ہونی چاہیے۔ اگرچہ اس طرح کی کوئی چیز ابھی تک میں نے محسوس نہیں کی ہے مگر پھر بھی آپ کو اس طرح توجہ دلانے کی ضرورت ہے جو کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ یعنی اخلاقی اصولوں پر دُنیا کی اصلاح کرنا اور دُنیا کے نظم کو درست کرنا اس کا تقاضا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے ہم اپنے آپ کو دُنیا کا صالح ترین گروہ ثابت کر دکھائیں جس طرح ہمیں دُنیا کے موجودہ بگاڑ پر تنقید کرنے کا حق ہے۔ اسی طرح دُنیا کو بھی یہ دیکھنے کا حق ہے کہ ہم انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر کیسے رہتے ہیں۔ کیا برتاؤ کرتے ہیں، کس طرح جمع ہوتے ہیں اور کس طرح اپنے اجتماعات کا انتظام کرتے ہیں؟ اگر دُنیا نے دیکھا کہ ہمارے اجتماعات میں بدنظمی ہے۔ ہمارے مجمعوں میں انتشار و شور و غل ہوتا ہے۔ ہمارے رہنے اور بیٹھنے کی جگہیں بدسلیقگی کا منظر پیش کرتی ہیں جہاں کھانے بیٹھتے ہیں وہاں آس پاس کا سارا ماحول غلیظ اور گندہ ہو جاتا ہے اور جہاں ہم مشورے کے لیے جمع ہوتے ہیں وہاں ٹھٹھے اور مذاق اور قہقہے اور جھگڑے برپا ہوتے ہیں۔ اور بے قاعدہ حرکات کی نمائش ہوتی ہے تو دُنیا ہم سے اور ہمارے ہاتھوں سے ہونے والی اصلاح سے خدا کی پناہ مانگے گی اور یہ محسوس کرے گی کہ اگر کہیں زمین کا انتظام ان لوگوں کے ہاتھ میں آگیا تو یہ ساری زمین کو ایسا ہی کر کے چھوڑیں گے جیسے یہ خود ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے اجتماعات کے دوران میں نظم، باقاعدگی، سنجیدگی، وقار، صفائی و طہارت، حسنِ اخلاق اور خوش سلیقگی کا ایسا مکمل مظاہرہ کریں جو دُنیا میں نمونہ بن سکے۔ آپ کے ہاں خواہ ہزاروں آدمی جمع ہوں لیکن کوئی شور و غل برپا نہ ہونے پائے۔ کسی طرف غلاظت اور گندگی نہ پھیلے۔ کسی قسم کے نزاعات اور جھگڑے نہ برپا ہوں۔ کہیں بھیڑ اور ہلڑ کی کیفیت نظر نہ آئے۔ ایک منظم گروہ کی طرح اُٹھیے اور بیٹھیے۔ اور کھائیے اور جمع ہوجیئے اور منتشر ہو جائیے۔ آپ میں سے جن لوگوں نے حدیث کا مطالعہ کیا ہے انھوں نے دیکھا ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لحاظ سے اپنی جماعت کو کتنا سنجیدہ، باوقار، مہذب اور منضبط بنایا تھا اور اسلامی جماعت کے عرب پر چھا جانے میں اس کیفیت کا کتنا بڑا دخل تھا۔ ایک طرف مشرکین عرب کا یہ حال تھا کہ ان کا ایک چھوٹا سا دستہ بھی اگر کسی علاقہ سے گزر رہا ہوتا تھا تو شورِ محشر

برپا ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ ان کے بڑے سے بڑے لشکر بھی منزلوں پر منزلیں طے کرتے چلے جاتے تھے اور کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جہاد میں صحابہؓ کرام نے صورتِ حال سے متاثر ہو کر اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے تو حضورؐ نے فرمایا جس کو تم پکار رہے ہو وہ بہرہ نہیں ہے۔ یہی باوقار رویہ تھا جس کی تربیت دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار کا لشکر لے کر چلے تو اہلِ مکہ کو اس وقت تک کانوں کان آپ کے آنے کی خبر نہ ہو سکی جب تک کہ آپ نے خود ہی ان کے عین سر پر پہنچ کر آگیں روشن کرنے کا حکم نہ دیا۔ اس روش کی تقلید ہمیں بھی کرنی چاہیے۔ اور ہمارے اجتماعات میں بھی زیادہ سے زیادہ اِسی شان کی جھلک نظر آنی چاہیے۔ اِسی طرح اجتماع کے موقع پر جو دیانت و امانت کی محسوس کیفیت نظر آنی چاہیے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے دارالسلام کے اجتماع ۱۹۴۵ء میں فرمایا۔

"جہاں آپ جمع ہوں وہاں دیانت و امانت بالکل ایک محسوس و مشہود شکل میں نظر آنی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں کسی شخص کو اپنے سامان کی حفاظت کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت پیش نہ آئے۔ جس کا مال اور سامان جہاں رکھا ہو وہاں بغیر کسی نگران اور محافظ اور قفل اور کنجی کے محفوظ پڑا رہے۔ کسی کی چیز جہاں گری ہو وہیں اس کو آ کر پا لے۔ اور اگر کہیں دکان یا سٹال ہو تو فروخت کنندہ کے بغیر اس کا مال ٹھیک ٹھیک فروخت ہو۔ جو شخص کوئی چیز لے وہ ٹھیک حساب سے اس کی قیمت وہیں رکھ دے خواہ بیچنے والا وہاں موجود ہو یا نہ ہو۔

اسلامی تحریک سے اتفاق کا مفہوم بانیٔ جماعت نے متفقین سے خطاب کرتے ہوئے روداد حصّہ دوم کے صفحہ ۸ پر فرمایا۔

"ہمارے ہاں جماعت کی شرکت میں تو کوئی دشواری نہیں ہے مگر شرکت جماعت سے ذمہ داریوں کا جو بارِ گراں اٹھانا پڑتا ہے اس کے وزن کو آگے بڑھنے سے پہلے محسوس کر لینا چاہیے۔ رکنیت کی ذمہ داریوں کا صحیح صحیح اندازہ کیے بغیر جو لوگ ہماری طرف بڑھ آتے ہیں وہ نصب العین میں متحد ہونے کے باوجود زیادہ دیر تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتداً طریقِ کار کے اختلاف پر گہری نظر نہیں ہوتی لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے یہ اختلاف ابھرنے لگتا ہے اور لوگ

اپنے اپنے پسندیدہ طریقِ کار کی محبت کے جوش میں آکر نظمِ جماعت کی خلاف ورزی کر بیٹھتے ہیں اور بسا اوقات نصب العین تک سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اگر بہ رضا و رغبت دوسرے طریقوں کو چھوڑ کر ہمارا طریقہ کار اختیار کرنے پر آمادہ ہوں تو آیئے بسم اللہ۔ ورنہ جلدی نہ کیجیے۔ ہمارے لٹریچر کا بغور مطالعہ کرتے رہیے اور ہمارے کام کو مزید کچھ عرصہ دیکھ کر آخری رائے قائم کیجیے"۔

مزید فرمایا:

"بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بس متفق بن کر رہ گئے ہیں حالانکہ اتفاق کی حد تک صرف ان لوگوں کو رہنا چاہیے جو کسی وجہ سے اپنے آپ کو جماعت کے ڈسپلن میں نہ دے سکتے ہوں۔ باقی لوگوں کو آگے بڑھ کر رکنیت کی پوری ذمہ داری اٹھانی چاہیے۔ آخر اللہ کے دین کے تقاضوں سے محض متفق ہونے کے کیا معنی ہیں۔ جماعت کا اصل مدار اپنے ارکان پر ہے۔ انھی پر ہمارا زور ہے۔ ہم جو بھی پروگرام بنائیں گے ارکانِ جماعت کو سامنے رکھ کر بنائیں گے۔ ہم ارکان کی عام بھرتی نہیں کرنا چاہتے لیکن جو متفق ارکان کی طرح کام کر رہے ہیں اُن سے آگے بڑھنے کی اپیل ضرور کرتے ہیں"۔

تنظیم کی اندرونی اصلاح کے تقاضے

بانیِ جماعت نے تنظیم کو بگاڑ سے بچانے اور اس کی اصلاح اور ترقی کے جو مشورے دیے وہ روداد مجلسِ شوریٰ ۱۹ اپریل ۱۹۵۱ء میں ان الفاظ میں درج ہیں۔

"تمام مقامی جماعتیں (یعنی مقامی شاخیں)، اس امر کا خاص اہتمام کریں کہ اگر ان کے ارکان اور رفقائے جماعت کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اُسے ہرگز پرورش نہ پانے دیا جائے۔ بلکہ علم میں آتے ہی فوراً اسے دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔

جس حلقہ کی کسی ماتحت جماعت میں کوئی خرابی رونما ہو اس کے نظم کو جلدی سے جلدی خود اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر اس کو کسی بیرونی مدد کی ضرورت ہو تو ضلع اور حلقے کے نظم سے مدد لینی چاہیے۔

— ہر حلقہ کی جماعت اپنے حلقے کے عمدہ کارکنوں کی ایک ٹیم مقرر کرے جس سے بوقتِ ضرورت اصلاح اور کمزور علاقوں میں کام کو آگے بڑھانے کے لیے کام لیا جائے۔

— جہاں کسی حلقے کے نظم کی حالت خود قابلِ اصلاح ہو وہاں مرکز کی ہدایات کے ماتحت اصلاحِ حال کے لیے باہر سے کارکن بھیجے جائیں جو حالات کا مطالعہ کر کے خرابی کے اسباب

متعین اور اصلاح کی تدابیر تجویز کریں اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی صورتیں اختیار کریں۔ اس غرض کے لیے ایک مرکزی ٹیم بھی مقرر کی جائے جس کے ارکان جہاں بھی اس طرح کی کوئی ضرورت پیش آئے بروقت بھیج دیے جائیں اور انہیں اصلاحِ حال کے لیے تمام مناسب اقدام کرنے کا پورا اختیار ہو۔

— جماعت کے اندر خرابیوں کے در آنے کی ایک بڑی وجہ محاسبہ کی کمی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مقامی، ضلعی اور حلقوں کے ہفتہ وار، سہ ماہی اور ششماہی اجتماعات پابندی کے ساتھ منعقد کیے جائیں اور ان میں ارکان کی اخلاقی اور دینی حالت ان کے معاملات اور جماعت کے نظم میں ان کے طرزِ عمل کا اچھی طرح سے محاسبہ کیا جاتا رہے اور اگر کوئی کارکن اصلاح کی تمام کوششوں کے باوجود درست نہ ہو تو جماعت سے اس کے اخراج کی کارروائی میں بے جا تساہل سے کام نہ لیا جائے۔

— کارکنوں کی تربیت گاہیں خاص اہتمام کے ساتھ برابر قائم کی جاتی رہیں اور تربیت گاہوں کے اختتام کے بعد بھی اس امر کا اہتمام کیا جائے کہ کارکنانِ جماعت، قرآن وسنت اور دینی لٹریچر کا برابر مطالعہ کرتے رہیں۔

— ارکانِ جماعت میں جو بعض کچے لوگ داخل ہو گئے ہیں ان کو تربیت کے ذریعے اوپر اُٹھانے کی کوشش کیجیے۔ لیکن جو لوگ کوشش کے باوجود اصلاح قبول نہ کریں۔ ان کو جماعت سے چھانٹ دینے کی فکر کی جانی چاہیے۔

— جماعتِ اسلامی نے کبھی بھی تعدادِ ارکان کو زیادہ اہمیت نہیں دی وہ صرف انہی لوگوں کو اپنے اندر لینا چاہتی ہے جو دین و اخلاق اور اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کے ترازو میں پورے اُترتے ہیں۔

یہ ہیں ایک اسلامی تنظیم کے خدوخال اور اس کے دینی، اخلاقی اور اجتماعی تقاضے جو میں نے خود بانیٔ جماعت کی تقاریر اور نگارشات سے پیش کر دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس تنظیم کے اُصولوں کی روشنی میں اپنے آپ کو ڈھالنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عالمِ اسلام میں کمیونسٹ حکمتِ عملی

جناب عبد الکریم عابد صاحب

مسلمان اور غیر مسلمان ملکوں میں عالمی کمیونسٹ تحریک کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو گی کہ بین الاقوامی کمیونزم عالمِ اسلام میں نہ صرف اپنا ایک الگ، جداگانہ اور مخصوص طریق کار رکھتا ہے، بلکہ مسلمان ملکوں میں اس کے مقاصد بھی مختلف ہیں۔ جس چیز کو کمیونسٹ فلسفہ غیر مسلم ملکوں کے لیے خوب سمجھتا ہے اُسے وہ مسلمان ملکوں کے لیے ناخوب قرار دیتا ہے اور جو بات غیر مسلم ملکوں میں غلط اور بُری بنائی جاتی ہے اس کے صحیح اور اعلیٰ وارفع ہونے کا پروپیگنڈہ مسلمان ملکوں میں خاص اہتمام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کمیونسٹ حکمتِ عملی کے اس دلچسپ تضاد کو مغربی دانشوروں نے محسوس نہیں کیا اور اگر کہیں محسوس کیا بھی تو اس کا تذکرہ خلافِ مصلحت سمجھا۔ دوسری طرف ہم بھی اسے سمجھ نہیں سکے، لیکن اب آہستہ آہستہ مسلمان ملکوں میں مخصوص کمیونسٹ حکمتِ عملی کا احساس و ادراک کیا جانے لگا ہے، لیکن یہ کافی نہیں ہے اور ضرورت ہے کہ ہمارے دانشور اس پر توجہ مرکوز کریں اور اس کا تفصیلی تجزیہ کریں تاکہ کمیونسٹ چہروں کے جو نقاب ہیں وہ پہچانے جا سکیں۔

عالمِ اسلام کے کمیونسٹوں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ارضِ اسلام کے سیکولرائزیشن کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ سامراج کے ایجنٹوں کی

ایجنٹوں کی مدد کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں تو سیکولرازم کو بہ طورِ اصول قبول کر لیا گیا ہے، لیکن مسلمان ملکوں کا یہ معاملہ نہیں ہے، بلکہ اِدھر اسلامی حکومت، اسلامی دستور و آئین، اسلامی نظام، نفاذِ شریعت اور اس مفہوم کے دوسرے نعرے اثر اور طاقت رکھتے ہیں۔ اس لیے یہاں بنیادی اہمیت کا فریضہ سامراج سے لڑائی نہیں ہے، بلکہ سامراج کے منفی اور سرمایہ دارانہ نظام نے جو سیکولر ذہن پیدا کیا ہے۔ اُسے فتح یاب بنانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور یہ جدوجہد ایسی ہے جو سامراج اور اس کے ایجنٹوں کے نقطۂ نظر سے بھی پسندیدہ ہے۔ اِس اشتراکِ مقصد کی بنا پر مسلمان ملکوں میں سامراج سے کمیونسٹوں کا رشتہ تصادم کا نہیں، بلکہ تعاون کا ہے۔ اس تعاون سے ہی خطۂ اسلام کو سیکولر اثر کیا جا سکتا ہے اور سیکولرازم ہی کی سرزمین پر سوشلزم کا شجر برگ و بار لا سکتا ہے۔ اس لیے پہلی اہمیت کی بات سامراج دشمنی نہیں ہے، سیکولرازم کا فروغ اور نفاذ ہے۔ یہ بات کمیونسٹوں کے لیے اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ ان اسلامی اور دینی عناصر سے بھی ہاتھ ملانے کے لیے تیار نہیں ہوتے جو سچے مجاہدانہ جذبے کے ساتھ سامراج سے لڑتے ہیں۔ اسلامی اور دینی عناصر سے ہاتھ ملانا تو در کنار، یہ اُلٹا سامراج کے حامی اور مدد گار بن کر اسلامی اور دینی عناصر کا صفایا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی کچھ کمیونسٹوں نے مشرقِ وسطیٰ میں کیا۔ اور خود پاکستان میں اسکندر مرزا کی حمایت کا اظہار کرنے کے لیے کراچی میں مزدوروں کا جلوس نکالا۔ غلام محمد کی حمایت کی گئی۔ ایوبی آمریت کی تائید کی گئی۔ آئندہ بھی کمیونسٹ حکمتِ عملی یہی ہو گی کہ جو بھی آمر یا ڈکٹیٹر سیکولرازم کی حمایت کرے اُس کی بھرپور حمایت کی جائے، خواہ وہ سامراج کا کتنا ہی بڑا آلۂ کار ہو۔

غیر مسلم ملکوں میں کمیونسٹ پہلے تو جمہوریت اور جمہوری نظام کو یکسر مسترد کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں جمہوریت سرمایہ داری کا ایک ڈھکوسلا ہے، لیکن رفتہ رفتہ حکمتِ عملی تبدیل ہونے لگی۔ سٹالین کے بعد کمیونسٹوں نے نیا فلسفہ اپنایا۔

جس کی رو سے جمہوریت اور جمہوری اداروں کو ایک محترم چیز تسلیم کر لیا گیا لیکن جہاں تک مسلمان ملکوں کا تعلق ہے تو کمیونسٹ نظریہ یہی ہے کہ یہاں جمہوریت کو نہیں آنا چاہیے کیونکہ جمہور مسلمین کے احساسات کو بروئے کار آنے کا موقع دیا گیا تو نہ سیکولرازم کے لیے راہ صاف ہوگی نہ سوشلزم کے لیے گنجائش پیدا ہوگی۔ اس لیے مسلمان ملکوں میں اصل ضرورت جمہوریت کی نہیں، بلکہ ایک آمر کی ہے جو مصطفیٰ کمال اور رضا شاہ پہلوی کی طرح اسلامی اور مذہبی افکار کے علمبردار عناصر کو کچلے اور دبائے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں کمیونسٹ ایسی شخصیات کو ہیرو کے طور پر پیش کرتے ہیں جن کا جمہوریت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ ان شخصیات کو "مردانِ انقلاب" اس لیے قرار دیا جاتا ہے کہ یہ بدترین آمرانہ اور ظالمانہ طریقوں سے اسلامی عناصر کو کچلنے کی کارروائیاں کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں جمہوری اقدار، بنیادی حقوق اور عدلیہ کی آزادی کے تصور کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں۔

مسلمان ملکوں میں کمیونسٹوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جمہوریت کو آنے یا کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور کسی طرح سے فوجی عناصر میں نفوذ حاصل کر کے اور گٹھ جوڑ کر کے کوئی ایسا فوجی انقلاب لایا جائے جس سے لادینی یا سوشلسٹ مزاج کے ڈکٹیٹر برآمد کیے جا سکیں۔ اس مقصد کے لیے پاکستان میں کمیونسٹوں کی طرف سے پنڈی سازش کیس کی صورت جو پہلی ناکام کوشش ہوئی تھی، گو وہ ناکام رہی لیکن اس سلسلہ میں کمیونسٹ عناصر مایوس نہیں ہوئے۔ انہیں پوری پوری امید ہے کہ ایک نہ ایک دن کوئی فوجی ٹولہ ضرور ایسا برسرِ اقتدار آجائے گا جو سیکولرازم کا دلدادہ ہوگا۔ پس اس موقع پر کمیونسٹ اس فوجی انقلاب کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسلامی عناصر کو کچلنے کے لیے اپنی خدمات کے ساتھ آگے آگے چلیں گے۔

بعض لوگ کمیونسٹوں کی جانب سے پاکستان کی موجودہ ضیاء الحق حکومت کی مخالفت کو دیکھ کر یہ گمان کرتے ہیں کہ شاید کمیونسٹ فوجی حکومت کے حق میں نہیں، لیکن اُن کی غلط فہمی عبداللہ ملک کی تازہ ترین کتاب "تیسری دنیا، فوج اور اقتدارِ اعلیٰ

کے مطالعہ سے دُور ہو جائے گی۔ اِس کتاب میں عبداللہ ملک لکھتے ہیں کہ تیسری دنیا میں تبدیلی لانے والے عناصر کمزور ہیں اور فوج ہی وہ طاقتور عنصر ہے جو صحت مندانہ تبدیلیاں لا سکتا ہے۔ جب بھی فوج صحت مند تبدیلیوں کے لیے اپنا اقتدارِ اعلیٰ استعمال کرے تو ترقی پسند طاقتوں کا فریضہ ہے کہ وہ فوج کی حمایت کریں۔ گویا ضیاء الحق حکومت سے کمیونسٹوں کے اختلاف کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ فوجی حکومت ہے، بلکہ یہ ہے کہ یہ اسلام کا نام لیتی ہے۔ اگر یہ اسلام کا نام نہ لے اور کمیونسٹوں کی پسند کے مطابق "ترقی پسندانہ اصلاحات" نافذ کرے تو یہی فوجی حکمران انقلابی حکمران اور ترقی پسندوں کے محبوب بن جائیں گے۔

مسلمان ملکوں میں کمیونسٹ حکمت عملی، بیوروکریسی سے ربط و ضبط اور بیوروکریسی سے گٹھ جوڑ کو بھی بنیادی اہمیت دیتی ہے، کیونکہ کمیونسٹوں کی طاقت کا سرچشمہ بھی بیوروکریسی ہے۔ بیوروکریسی کو بھی معلوم ہے کہ سوشلزم کے نعرے اور پبلک سیکٹر کے فروغ کی وجہ سے ملکی صنعتوں اور صنعتی اداروں پر افسر شاہی کا کنٹرول ہو جاتا ہے۔ نیشنلائزیشن کے بعد افسروں کو دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹنے کا موقع ملتا ہے، اس لیے بیوروکریسی سوشلزم کا نعرہ لگانے والوں کو انعام و اکرام سے نوازتی رہتی ہے اور یہی مسلمان ملکوں میں سوشلسٹوں کی طاقت کا پس منظر ہے۔ اس پس منظر کی بنا پر ہی کمیونسٹوں اور بیوروکریسی کے درمیان گہرے رشتے پروان چڑھتے ہیں اور اسی وجہ سے خاص طور پر ذرائع ابلاغ میں کمیونسٹ عناصر چھائے رہتے ہیں۔

مسلمان ملکوں میں کمیونسٹوں کی ایک کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر طرح کے تضادات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا جائے اور ان کے ٹکراؤ کو انتہا تک پہنچایا جائے۔ اس لیے کمیونسٹ ہر وقت نسلی، علاقائی، لسانی عصبیتیں پھیلانے اور بھڑکانے میں مصروف رہتے ہیں۔ واحد قوم کی جگہ علیحدہ علیحدہ قومیتوں کا پرچار کیا جاتا ہے، صوبائی خود مختاری کے نام پر ملک دشمن ذہنیت کو فروغ دیا جاتا ہے، لیکن ایسا صرف مسلمان ملکوں میں

کیا جاتا ہے۔ غیر مسلم ملکوں میں اس کی بجائے وطنِ عزیز کی وحدت و سالمیت اور واحد قومیت کے احساس و ارتقا پر زور دیا جاتا ہے۔ مثلاً بھارت میں کمیونسٹ کسی علیحدگی پسند تحریک کی تائید نہیں کرتے۔ مقبوضہ کشمیر کے حریت پسند، مشرقی پنجاب کے اکالی، تامل ناڈو کے ڈرا ورکا زگام، آندھرا کی تلگودیشم پارٹی یا آسام کا ایجی ٹیشن، غرض ہر علاقے میں علیحدگی پسند تحریکوں کے خلاف سب سے بڑا اور سب سے مضبوط محاذ کمیونسٹوں کا ہے۔ وہ ان علاقائی و لسانی حقوق کے علمبرداروں سے یہ کہتے ہیں کہ انسانیت کو علیحدہ علیحدہ چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں بانٹنے کا دَور گزر گیا۔ تاریخ کا سفر منزلِ وحدت کی جانب ہے۔ اسی لیے بھارت میں صوبہ داری اور لسانی عصبیتوں کی بنا پر سیاست غلط ہے، لیکن یہی بات وہ پاکستان میں کہنے کے لیے تیار نہیں اور پاکستان یا عالمِ اسلام کے دوسرے حقوق میں تفرقہ برپا کرنا، تعصبات کو بھڑکانا اور خانہ جنگی کے معاملات پیدا کرنا اُن کا بنیادی مقصد قرار پاتا ہے۔

آپ نے اکثر مسلمان ملکوں میں کمیونسٹوں کو علاقائی تہذیبوں کا جھنڈا لہراتے دیکھا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایک مسلم تہذیب یا اسلامی تہذیب کی وحدت کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ مسلمان تہذیبی طور پر اپنی اسلامیت سے مرتد ہو کر علاقائیت کو اپنی تہذیبی اساس مان لیں، حالانکہ جو علاقائی تہذیبیں ہیں وہ کمیونسٹ فلسفہ کے نقطۂ نظر سے ماضی کی سڑی گلی جاگیردارانہ اور قبائلی تہذیب کا ورثہ ہیں۔ کمیونزم کی تعلیم یہ ہے کہ محنت کش عوام کو اس پرانے لوک ورثہ یا ماضی کی تہذیب سے نجات حاصل کر کے جدید پرولتاری کلچر کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔ کیونکہ جب ساری دُنیا کے مزدور ایک ہیں تو آگے چل کر سارے مزدوروں کی تہذیب بھی ایک ہوگی۔ بخلاف اس کے عالمِ اسلام میں کمیونسٹ دانش ور مزدور آبادی کے شہری پرولتاری کلچر کے بجائے دیہاتیوں کی لوک تہذیب کے گیت گاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ علاقائی تہذیب پر زور دینے سے معاشرہ کی اسلامی وحدت کو مجروح کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ پس وہ پرولتاری کلچر کا لفظ بھی

زبان پر نہیں لاتے اور علاقائی کلچروں کی بات کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے غیر مسلم ملکوں میں علاقائیت پر یہ زور و شور نہیں ہے۔ اسے صرف مسلمان ملکوں ہی کے لیے مفید سمجھا گیا ہے۔ بھارت کے کمیونسٹ دانشوروں کی تحریریں پڑھ لیجیے، وہ علاقائیت اور علاقائی تہذیبوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور اسے ماضی کی ناکارہ شئے بتاتے ہیں۔ اِدھر ہمارے پاکستانی کمیونسٹ دانشور اس کے بالکل برعکس خیالات کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔

عالمِ اسلام میں کمیونسٹوں کی حکمتِ عملی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اسلامی عناصر باہم متحد نہ ہوں اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں۔ اِس کے لیے وہ کیا کیا تدبیریں کرتے ہیں اور کس کس طرح سے اپنا یہ مقصد حاصل کرتے ہیں۔ اس پر ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اسلامی عناصر کو آپس میں لڑتے بھڑتے رکھنا کمیونسٹ ڈپلومیسی کا ایک اہم اصول ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان ملکوں میں فواحش و منکرات کو فروغ دینے کے لیے بھی کمیونسٹ خاص طور پر کام کرتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں منکرات و فواحش کے ذریعے اسلامی رُوح کو کمزور کیا جاسکتا ہے، بلکہ وہ ادب اور فنونِ لطیفہ کے پردوں میں عیاشی اور فحاشی کا زہر نوجوانوں میں پھیلاتے رہتے ہیں۔ نیز خدا اور مذہب اور اخلاقیات کے خلاف فن کو استعمال کرتے ہیں۔

ان سب نکات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان ملکوں میں کمیونسٹ حکمتِ عملی کا اہم نکتہ یہ ہے کہ یہاں سامراج کے تعاون اور بیوروکریسی کے گٹھ جوڑ سے مسلمانوں میں نامسلمان ذہنیت پیدا کی جائے اور جمہوریت کو نہ آنے دیا جائے اور آمریت کی راتوں ہی کو ملک پر مسلط رہنے دیا جائے۔ کیوں کہ شب خون مارنے کا موقع راتوں ہی میں نکل سکتا ہے، دن کی روشنی میں نہیں۔

جامع اور مؤثر تحریکی کام کا خاکہ

(حالیہ انتخابی مہم اور مستقبل کو ملحوظ رکھتے ہوئے)

جناب نعیم صدیقی صاحب

میں ترجمان القرآن میں لکھ چکا ہوں کہ سیاسی و انتخابی دائرے میں ہمارے سامنے محض افراد نہیں ہیں بلکہ لادینیت، مغربیت، وڈیرہ ازم، جاگیرداری، غنڈہ گردی، برادریوں کی عصبیتیں، ضمیر کش دولت کی پیدا کردہ بدعنوانیاں، تسلط یافتہ بیوروکریسی اور طرح طرح کے ازموں سے بنی ہوئی ایک آہنی فصیل پیش قدمی میں حائل ہے، اور یہ فصیل انگریزی غلامی کے دور سے آج تک اپنی ساخت میں جوں کی توں ہے۔ اس دیوار میں سے چند اینٹیں اکھیڑ کر ان کی جگہ چند نئی اینٹیں اپنی پسند کی لگا دینے سے اصل مدعا حاصل نہ ہوگا بلکہ ضرورت اس کی خاص خاص برجیوں کو توڑ کر اتنا کمزور کر دینے کی ہے کہ بعد میں لگنے والے چند دھکے اسے گرا سکیں۔

اس مہم کے لیے ہمارے پاس نہ برادریوں کی قوت ہے، نہ فرقہ بندیوں کا سہارا ہے، نہ روپے پیسے کا زور ہے، نہ جاگیریں ہیں، نہ بیوروکریسی کی حمایت ہے، بلکہ ہماری تمام تر قوت ہمارا نظریہ حیات اور اسلامی تحریکِ انقلاب ہے اور اس قوت کو روبعمل لانے کے لیے ہمیں اِس نظریہ و تحریک کے علمبرداروں کی زیادہ سے زیادہ اور روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد درکار ہے۔ اس تعداد کے حصول میں اگر ہم کوتاہ رہتے ہیں تو سارا کھیل خراب ہوتا ہے، اسے اگر ناجائز طریقوں سے حاصل کرتے ہیں تو درحقیقت ہم مخالفِ اسلام قوت ہی کا کام کرتے ہیں اور اگر ہم دعوتِ حق کے راستے سے، شدید جانفشانی کر کے اسے حاصل کرنے اور بڑھانے میں ــــ اور

یہ نہیں ممکن ہے ــــــــ تو بازی سر ہو سکتی ہے۔

اسی شعور کی بنا پر یہ خاکہ احباب کے لیے ایک مشورہ کے طور پر میں نے چند ہی روز پہلے مرتب کیا تھا[1] اس کا محرک بعض دوستوں کی یہ سرسری رائیں ہوئی تھیں کہ ہم اپنے دعوتی، تربیتی اور تحریکی کام کے ذریعے کبھی ایسی حالت میں نہیں آسکتے کہ ناجائز انتخابی ہتھکنڈوں سے پرہیز کرتے ہوئے اور دیانت و شرافت کے اُصولوں کو محکم رکھتے ہوئے کوئی انتخابی معرکہ جیت سکیں۔ میرا نقطۂ نظر بہت پہلے سے اس کے خلاف تھا۔ خاص طور پر لاہور کے پچھلے ۲۵، ۳۰ سالہ دَور کے کام کو سامنے رکھتے ہوئے اور اس کی روشنی میں ملک بھر کی دعوتی سرگرمیوں کا تصور کرتے ہوئے میری رائے یہی رہی کہ جو کام ہونا چاہیے اور جس کی روایات شروع شروع میں حُسن و خوبی سے قائم ہوئی تھیں، نہیں ہو رہا۔ سب سے بڑی کوتاہی بالمشافہ گفتگوؤں اور رابطوں اور خدمتی تعلقات میں رہی ہے۔ یہ سلسلہ منقطع رہا کہ روزانہ یا ہفتہ میں دو ایک بار خصوصی دعوتی ملاقاتوں کے لیے نکلا جائے، موقع کی ضروریات کے مطابق لٹریچر تقسیم کیا جائے، لوگوں کے سماجی اور گھریلو حالات میں خاص دلچسپی سے حصہ لیا جائے، ان کی نجی اور محلہ داری یا اجتماعی اور دینی تقاریب میں شرکت کی جائے۔ عام قسم کے ذاتی یا گھریلو یا محلہ داری مسائل کے حل میں مدد دی جائے۔ مریض اور معذور افراد کی خود مدد کرنے کے علاوہ اڑوس پڑوس کے لوگوں کو آمادہ کیا جائے، نادار بچیوں کے نکاح کے لیے انتظامات کرائے جائیں، بیواؤں اور یتیموں کے مصائب کا بوجھ کم کرایا جائے وغیرہ۔ غرضیکہ عام طور پر تحریکِ اسلامی کے کسی گھر کے متعلق ہر طرف یہ محسوس کیا جائے کہ انسانوں کے لیے محبت و ہمدردی کا ایک سرچشمہ جاری ہے اور ایمان اور کردار کی ایک روشنی مل رہی ہے۔

---

[1] کام کا جو منصوبہ جماعت کی طرف سے پاس کیا گیا ہے۔ اس سے فی نفسہٖ مجھے کوئی اختلاف نا حال نہیں ہے۔ یہ خاکہ کوئی جوابی خاکہ نہیں ہے۔ بلکہ اسے منصوبے کے بجائے بعض نکات کی تعبیر سمجھا جائے۔ خیال رہے کہ یہ اس سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔

خاصے لمبے عرصے سے زیادہ تر انحصار پوسٹروں، ہینڈ بلوں، پمفلٹوں، جلسوں، تقاریر اور بیانات پر ہو گیا ہے اور ہماری سرگرمیوں کا بڑا حصہ دفتری زندگی اور دفتری اجتماعات قرار پا گئے ہیں۔ حتیٰ کہ پاس پڑوس کی عام معلومات اور لوگوں سے علیک سلیک کی رسم بھی مدھم پڑتی جا رہی ہے۔ بلکہ کہیں کہیں مخالفین ہی کے لیے نہیں، تحریک سے اختلاف کرنے والوں اور دعوتِ اسلامی کے ناواقف لوگوں تک کے لیے ایک طرح کی مخفی کراہت و تحقیر نہیں تو بے نیازی ضرور پائی جاتی ہے۔ سچائی کے علم سے محروم اور دین سے دُور افتادہ تمام لوگ مریضوں اور زخمیوں کی طرح ہمدردی کے مستحق ہیں اور سچے جذبۂ محبت سے ان کی مدد اور دستگیری کرنا کسی بھی داعیٔ حق کی بھاری ذمہ داری ہے۔

پچھلا غیر جماعتی دَور جو سات ساڑھے سات سال پر محیط تھا، ہم نے کچھ تو جمود میں، کچھ اضطراب میں، کچھ مایوسی میں اور کچھ آپس کی بحثا بحثی میں گذار دیا۔ اور اصل کام سے اپنے آپ کو چھٹی پر سمجھا۔ ورنہ نہایت ہی کم معیار کی کارکردگی کے تصوّر سے اگر اتنا سیدھا سا اوسط سامنے رکھا جائے تو ہر فرد سال بھر کی دعوتی محنت سے فقط دو[1] افراد کو تحریک کے دائرے میں لاتا تو سات سال میں ۱:۱۲۸ کی نسبت سے اضافہ ہوتا۔ مجھے صدمہ ہوتا ہے کہ ہم نے اتنا وقت کچھ ایسی لاپرواہی سے ضائع کیا جیسے ہم پر خدا پرستانہ تحریک کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس کوتاہی کے بعد جب ہم حالات کی ناسازگاری کا، اور عامۃ الناس کی بے توجہی کا اور ووٹروں کے عدم تعاون کا مایوسی کی لے میں ماتم کرتے ہیں تو مجھے انسان کی زیرکی کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی کوتاہ کاریوں سے نگاہیں چرا کر سارا الزام دوسروں پر ڈال دیتا ہے۔

انتخابات کے تجربے میں ہمارے کام کا سارا ماحصل سامنے آگیا ہے، اور میری رائے یہ ہے کہ اگر ہم اپنی کوتاہ کاریوں کا صحیح تجزیہ کر سکیں تو آئندہ پانچ سال میں ملک کے کوئی سے بھی پسندیدہ حلقے کو ہم اس حد تک تیار کر سکتے ہیں کہ انتخابی عمل کو شروع کرتے وقت پہلے سے ہمارے پاس

---

[1] سالانہ کارکردگی کی یہ انتہائی کم مقدار ہے، صحیح اوسط ۵ ہونی چاہیے۔ جو لوگ زائد کام کر سکیں تو ان کی ہمت!

۲ تا ۵ ہزار مخلص فعال کارکن موجود ہوں۔ اور ایسی صورت میں ہرگز مشکل نہیں کہ مہینہ دو مہینہ کی جانفشانی سے روپے، برادری، فرقہ واریت، غنڈہ ازم، جعلی ووٹنگ اور ہر دوسری مزاحمت کا مقابلہ کر کے فتح حاصل نہ کی جاسکے۔ بلکہ میں تو یہ تک کہتا ہوں کہ کتنے ہی حلقوں کا کام اتنا پختہ ہوسکتا ہے کہ وقت آنے پر ہم چیلنج کر کے کہہ سکیں کہ یہ ہیں ہمارے حلقے، جس کا جی چاہے یہاں ہم سے مقابلہ کر لے۔ آخر کل ہی تو ہمارے سامنے ڈاکٹر نذیر شہید نے مثال قائم کر کے چھوڑی ہے کہ پیپلز پارٹی کے تیز و تند سیلاب کے امڈنے کے باوجود، باہر سے آئے ہوئے ایک مہاجر نے ہر قسم کی مزاحمتوں کو شکست دے کر آئندہ کے لیے کام کرنے والوں کو راستہ دکھا دیا۔ آج کسی اور جگہ وہی کچھ کیوں نہیں ہوسکتا؟

ہر حلقے میں ویسا ہی زوردار کام کیا جاسکتا ہے اور جگہ جگہ تھوڑے بہت طریقوں کا ادل بدل بھی ہوسکتا ہے۔

آئندہ صفحات میں کاموں کا ایک خاکہ دیا جا رہا ہے جسے ابھی مکمل نہ سمجھا جائے بلکہ اور حضرات کے مشورے بھی جمع ہوتے رہیں گے۔ لیکن ایک انتباہ ضروری ہے۔ ہمارے کام کا اصل ہدف اقامتِ دین اور ہماری ابتدائی دعوت خدا پرستی اور اخلاقِ حسنہ کی ہے۔ انتخابات محض ایک دائرہ کار فراہم کرتے ہیں۔ جس طرح مساجد میں، نظامِ تعلیم میں، عائلی زندگی میں، ادب میں، اعانتِ مہاجرین میں، عالمِ اسلامی کی فلاح طلبی میں کئی قسم کے میدان ہائے کار ہمارے سامنے ہیں۔ اسی طرح ایک میدانِ کار انتخابات کا بھی ہے۔ اس گذارش سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ ماسوا عین دورِ انتخاب کے، ہمیں لوگوں کو ووٹ دینے کے لیے نہیں کہنا ہے بلکہ خدا پرستی اور پابندیٔ دین اور پیرویٔ اخلاقِ حسنہ کی تلقین کرنی ہے۔ یہ قدرتی نتیجہ خود نکلے گا کہ جو لوگ صحیح تصورِ دین کے ساتھ دعوتِ حق قبول کریں گے۔ وہ جس طرح دوسرے مختلف دوائر میں ہمارے ساتھ تعاون کریں گے، اسی طرح انتخابی دائرے میں بھی تعاون کریں گے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ ہم فقط ایک پارلیمنٹری پارٹی بن کر رہ جائیں اور صرف ووٹوں اور سیٹوں اور وزارتوں کی اصطلاحوں کے کانٹے پر دینی اصول و اقدار کو تولنے لگیں۔

راقم کا خیال ہے کہ صرف ایک تخمینے کے طور پر تو یہ اوسط سامنے رکھ لینا چاہیے کہ تحریک کا

ہر فرد رکن ہو یا فعال کارکن، یا حامی و ہمدرد، سال بھر میں کم سے کم دو افراد کو تحریکی حلقوں سے کسی نہ کسی درجے میں وابستہ کرے۔ ارکان کی بھرتی کے لیے منصوبہ بندی کے تحت تعداد معین کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ محض "ٹارگٹ" پورے کرنے کے لیے کچی بھرتی نہ ہونے لگے جو اس سے پہلے بھی تھوڑی بہت ہوئی ہے اور غیر محسوس طور پر اس کے بُرے اثرات بھی پڑے ہیں۔ اس بات کو جانچنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے نئے ارکان میں سے کس کس نے بنیادی لٹریچر بھی پوری طرح پڑھا نہیں ہے؟ کیا بعض لوگ اُس رضاکارانہ اسپرٹ کے معاملے میں کمزور نہیں ہیں جو حدودِ شریعت کا ایسا وفادار پابند بناتی ہے کہ آدمی کی خواہشات کے دباؤ سے اس کی عقل بے جا تاویل بازی کی جرأت نہیں کر سکتی۔ نگاہِ احتساب سے کسی ایسے شخص کو بھی امان نہیں ملنی چاہیے جو جماعت کی طے کردہ پالیسیوں کے خلاف برسرِعام باتیں کر کے پھر بھی نہ صرف رُکن رہے بلکہ نئی کچی بھرتی کا آدمی ہونے کے باوجود کسی ذمہ داری کے لیے بھی موزوں قرار پائے۔

ہماری دعوت کی بہت بڑی قوت خود ہمارا پابندِ اصول ہونا اور اپنے اعتقادات و کردار کے معیار اور اپنے تحریکی تشخص کا تحفظ کرنا ہے۔ اگر ہم اپنے اصولوں اور کردار اور تشخص میں لچک پیدا کرتے جائیں اور جو لکیریں جواز و عدم جواز کی کھینچی تھیں انھیں آگے پیچھے کرتے رہیں تو ہماری ساکھ خراب ہو گی ___ اپنے اندرونی حلقوں میں بھی اور باہر کے زیرِ دعوت حلقوں میں بھی۔

اِس خاکے میں اصل زور نتائج کی مقداروں کے تعین پر نہیں دیا گیا بلکہ کام کے ساتھ مساعی اور تدابیر کے خطوط تجویز کیے گئے ہیں۔ اگر ان خطوط پر لگن اور محنت سے کام کیا جائے اور اسے مسلسل جاری رکھا جائے تو نتائج از خود نکلیں گے۔ ایک فرد اگر سال بھر میں ۲ افراد کو متاثر کرنے کی اوسط کے مطابق کام کرے تو آیندہ پانچ سال میں ہماری قوت کا مجموعی اضافہ ۱ : ۳۲ کے تناسب سے ہونا چاہیے۔ یعنی ارکان، متفقین، ہمدرد اور حامی آج اگر ۲ لاکھ ہیں تو پانچ سال بعد ان کو ۶۴ لاکھ تک پہنچ جانا چاہیے۔

مساعی اور تدابیر

کام کرنے کے حسبِ ذیل روایتی طریقے برقرار رکھے جائیں:

تقاریر، جلسے، اجتماعات، بیانات، قراردادیں، پوسٹر، پمفلٹ، تقسیم لٹریچر، درس،

تربیت گاہیں وغیرہ۔

ذاتی رابطوں کی توسیع

ہم محلہ اور ہم کار اور خصوصی واقفیت کے حلقوں میں بیمار پرسی، شرکتِ جنائز و دیگر تقاریب میں شرکت۔

خصوصی حوادث کی شکل میں ہمدردانہ دلچسپی —— مثلاً گھر میں آگ لگ گئی، چوری ہو گئی یا کوئی قتل، یا ناجائز گرفتاری کا واقعہ پیش آگیا۔

اپنے محلے، اپنے بازار یا اپنے دفتر سے متعلقہ اجتماعی بہبود کے لیے دوسروں سے تعاون، بلکہ خود ایسے کاموں کے لیے اجتماعیت پیدا کرنا۔

اپنے اپنے دلچسپی کے حلقوں —— مثلاً کاروباری، علمی، ادبی، سیاسی، صحافتی وغیرہ میں جماعتی رابطے کے بغیر شریف اور فعال لوگوں میں سے چند کے ساتھ آہستہ آہستہ دوستی کی نشوونما۔

اجتماعی آفات کی صورت میں بستی، محلے اور دیگر حلقوں میں مصیبت زدوں کی خدمت اور لوگوں سے تعاون کے لیے پہنچنا۔

ضرورت مندوں کو جائز امور کے لیے درخواستیں تیار کر دینا، خاص قسم کے فارم حاصل کر دینا، دفتروں یا اداروں سے رابطہ کرنے میں ان کی رہنمائی اور مدد کرنا۔

تعلیمی داخلوں اور ہسپتالوں میں مریضوں کے داخلے کے لیے خاص توجہ سے کمزور اور غریب اور دوسرے مدد طلب کرنے والوں کی جائز مدد کرنا[1]۔

ہسپتالوں کے ڈاکٹروں، پرائیویٹ معالجوں، وکیلوں، ایڈیٹروں، پروفیسروں، ہیڈ ماسٹروں استادوں، پٹواریوں، واپڈا کے افسروں اور کارکنوں، سوئی گیس والوں اور دیگر با اثر افراد میں سے بعض کے ساتھ تعلقات رکھنا۔

[1] یہ احتیاط ضروری ہے کہ محض جتھا بندی کی بنا پر حقداروں کی حق ماری کر کے نااہل اور ناموزوں افراد کو آگے نہ بڑھایا جائے۔

بجلی، پانی، سوئی گیس، ٹیلی فون اور دیگر روزمرہ اُمور میں لوگوں کی مختلف مشکلات حل کرانے میں ان کی رہنمائی کرنا اور مدد دینا۔

زکوٰۃ کے مستحقین کی درخواستیں تیار کرا کے ان کے لیے مدد حاصل کرنا، اُن میں فطرانے اور قربانی کے گوشت کی تقسیم میں خود پیش پیش رہنا۔

بڑے درجے کے عمائد ہوں یا عام کارکن، اپنی اپنی سطح پر سب کا یہ اہتمام کرنا کہ وہ تعلقات کے حلقے بنائیں۔ اور اپنے تمام اوقات کو دفتروں اور جلسوں ہی میں نہ کھپا دیں۔ کیونکہ انسانی علائق سے الگ بیٹھ کر کام کرنے سے صحیح تحریکی مزاج پیدا نہیں ہوتا۔

کسی بھی شہر میں جانے پر عمائدین کی طرف سے خاص طور پر یہ اہتمام کہ وہ وہاں معتدل مزاج علما سے ملیں، جماعت سے باہر کی بھی بعض شخصیتوں سے ملیں۔ اہم اخباری افراد سے بھی رابطہ پیدا کریں۔

جن لوگوں سے دوستی ہو جائے اور روابط کا سلسلہ چلے، ان کے ہاں کبھی کبھار خود جا کر بات چیت کرنا اور کبھی ان کو کھانے چائے پر یا اس کے بغیر مدعو کرنا۔

ابتدائی قسم کے رابطوں کے دائرے میں ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں گردوپیش کے حالات، وقتی خبروں، اخلاقی بگاڑ اور خود مخاطب کی کسی پریشانی کے حوالے سے خدا پرستی کی طرف توجہ دلانا۔ پھر جہاں جہاں بات آگے بڑھے، وہاں لٹریچر سے کام لینا اور اجتماعات وغیرہ کے لیے ذاتی طور پر ساتھ لینا۔

تمام اکابر و ارکان اہتمام رکھیں کہ آس پاس کی مساجد کے خطیبوں اور ائمہ کو کسی خاص موضوع پر بات چیت کے لیے مہینے میں ایک بار جمع کریں اور چائے یا کھانے سے ان کی تواضع کریں۔ موضوعات بحث "غلبہ دین کا طریقہ"، "اتحادِ ملت"، "رفع نزاعات"، "فتنہ ہائے عصر حاضر" اور "دُنیا کے مظلوم مسلمانوں کے تحفظ" وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ بات چیت کو کسی تلخ بحث کی طرف نہ جانے دیا جائے۔

ادارات کے ذریعے رابطے

جہاں ممکن ہو، پرائمری، مڈل یا ہائی اسکول یا ٹیوٹوریل کوچنگ کلاسز کا اجرا۔ برائے

طلبہ و طالبات۔ ایسے اداروں کے ذریعے طلبہ کی اسلامی نہج پر تربیت اور ان کے والدین میں اثر و نفوذ۔ طالبات کے اداروں میں پردے (چھوٹی ہوں تو دوپٹوں اور بڑی ہوں تو برقعوں) کی لازمی ترویج۔

○ طبی مراکز جو پہلے بھی ہیں، ان میں اضافہ کرنا۔ نیز ان میں تحریکی افادیت کے لیے نئے اسالیب پیدا کرنا۔

— مثلاً دوا لینے کے لیے یہ تاکید کہ نماز پڑھ کر اور دُعا مانگ کر لی جائے۔

— مختلف تکالیف کے لیے بعض آیات اور بعض دعائیں (مختصر) مطبوعہ مہیا کرنا اور تاکید کرنا دوا لیتے ہوئے یا تکلیف زیادہ ہو تو یہ پڑھا جائے۔ اسمائے الٰہی بھی ہو سکتے ہیں۔

— دورانِ علاج حرام رزق سے پرہیز کیا جائے۔

— ہر روز ایک روٹی یا ایک آنہ (دس پیسہ) خیرات کر دیا جائے۔

— تکلیف رفع ہونے پر ۲ رکعت نمازِ شکرانہ ادا کرنے کی تلقین، یا خوش حال لوگوں کو صدقہ کی تلقین۔

— ہر مریض کو 'شفا' کے عنوان سے لکھا ہوا ایسا مختصر لٹریچر (دو یا چار ورق تک) مہیا کرنا ہے جس میں خدا سے تعلق، خوش اخلاقی، خدمتِ خلق، انفاق فی سبیل اللہ اور دین کی سربلندی کے لیے دل لگا کر کام کرنے کو بنیادی ذریعۂ شفا قرار دیا جائے۔ اس قسم کی تحریروں کو ہر تین ماہ بعد بدلا جا سکتا ہے، مقصد اپنی جگہ برقرار رہے۔

○ فری ٹیکہ لگانے کے انتظامات — غریب مردوں کے لیے، خواتین کے لیے۔

○ اب اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ماڈرن خواتین کے بڑھتے ہوئے کام کے بالمقابل ہمارے ہاں بھی سلائی کڑھائی، خانہ داری اور دستکاری سکھانے کے مراکز ہوں۔ جہاں فیس لے کر ماہر استانیوں کے ذریعے کام سکھایا جائے۔ ایسے اداروں میں اسلامی رُوح کو غالب رکھنے کے لیے ان کا آغازِ کار ہر روز درس سے ہو۔ ان میں آنے

والوں کو کم سے کم درجے کی پابندیٔ حجاب پر کاربند کیا جائے اور انہیں ہفتہ میں ایک دو لیکچر کے ذریعے فتنہ ہائے عصرِ رواں (بحوالۂ ملکی حالات) سے چوکنا رکھا جائے۔ ان میں اسلامی دعوت و تبلیغ کا جذبہ پیدا کر دیا جائے۔

- بعض اچھے گھروں یا حویلیوں یا ہالوں میں خواتین کے نیم تفریحی اجتماعات جن میں کچھ خواتین گھرداری، لباس، کھانوں، حفظانِ صحت اور تربیتِ اطفال پر اظہارِ خیال کریں، نیز اپنی دستکاریوں کی نمائش لگائیں اور ان کو فروخت بھی کریں۔ ایسے اجتماعات یا مقامات پر نہ مردوں کا داخلہ ہو اور نہ فوٹو گرافی کی جائے۔ حجاب اور پردے اور خواتین کے مختلف مسائل پر بھی گفتگوئیں کی جاسکتی ہیں۔
- جتنے زیادہ مقامات پر ممکن ہو، تحریکی خواتین مردوں کے تعاون سے زچہ و بچہ سنٹرز قائم کریں اور ان کے ذریعے مریض اور تیاردار خواتین میں اپنا پیغام پھیلائیں۔
- خواتین گھروں میں قرآن ناظرہ اور تعلیمِ نماز کے مراکز قائم کریں۔
- "اسلامی ڈرگ بنک" کا قیام بھی نہایت مفید ہو سکتا ہے۔ دنیا میں ریڈ کراس اور دوسری رفاہی تنظیمیں یہ کام کرتی ہیں۔ انڈیا میں ایسا تجربہ ہو رہا ہے۔ پاکستان میں بھی بعض ہسپتالوں میں پرانی دوائیں جمع کرانے کے کاؤنٹر ہیں، مگر اس سلسلے میں کوئی تحریک نہیں۔

اس کام کے کرنے کا باقاعدہ طریقہ یہ ہے کہ اخبارات میں اعلان کیا جائے کہ جن لوگوں کے ہاں بچے ہوئے ٹیکے یا دوائیں پڑی ہوں وہ انہیں ضائع ہونے سے بچائیں اور ہمارے دفتروں میں جمع کرا کے ضرورت مند مریضوں کی خدمت کا ذریعہ بنیں اور ثواب حاصل کریں۔ ایسی دوائیں چند مرکزوں پر جمع ہوں، پھر ڈاکٹر حضرات ان کا معائنہ کریں اور جو زائد المیعاد ہوگئی ہوں یا جن کا استعمال دیر تک کھلے رہنے کی وجہ سے مناسب نہ ہو انہیں تلف کرا دیا جائے۔ بقیہ صحیح دواؤں کو اپنے قائم کردہ طبی اداروں میں زیرِ استعمال لایا جائے۔

- جس طرح ادبی و علمی دلچسپی کے لیے حلقے بنائے جاتے ہیں، اسی طرح سیاسی، معاشی اور

عام مسائل پر مشترک مجالس میں بحثیں اُٹھانے کے لیے مختلف فورم اور پلیٹ فارم بنائے جائیں۔ ایسی مجالس میں معاشرے کا ہر اہم مسئلہ زیرِ غور آئے اور ہر نقطۂ نظر سے اس پر روشنی پڑے۔ اہتمام یہ ہونا چاہیے کہ اختلافات کی تو گنجائش ہو، اہلِ فتنہ کو نفوذ نہ کرنے دیا جائے اور کار فرما قوت کا محورِ فکر و نظر اسلام ہو۔

٥— شہروں اور قصبوں میں صحت مند ذہن کے وکیلوں اور ڈاکٹروں اور انجینئرز اور اقتصادی عالموں کے الگ الگ حلقے بھی تشکیل پانے چاہییں جن میں اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے اور معاشرے کے مسائل و احوال پر بحثیں کر کے وہ خاص خاص نتائج نکالیں، حکومت سے مطالبے بھی کریں اور عوام کی تربیت و رہنمائی کا فرض بھی انجام دیں۔

٥— وسیع تحریکی حلقۂ اثر کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ نہ صرف معروف لکھنے والے اپنے ادبی حلقے منظم کریں، بلکہ ہر بڑے مقام پر نوجوان طلبہ بھی بعض سائنسیوں کو خاص طور پر اس مہم پر لگائیں۔ اسی طرح خواتین اور طالبات مل کر اپنے اپنے ادبی حلقے بنائیں۔ ان سارے حلقوں کے وابستگان کبھی کبھار اکٹھے ہو کر بھی اجلاس کر سکتے ہیں۔

٥— ایسے حلقہ ہائے مطالعہ کا قیام جن میں اپنے لوگوں اور نوجوانوں کے ساتھ باہر کے نوجوان بھی شریک ہوں۔ ان کا طریقِ کار یہ ہو کہ ہر اجلاس میں اسلامی اور جدید علوم اور احوالِ تازہ کے متعلق کتابوں کو پہلے سے پڑھ کر ان کی تلخیص پیش کی جائے اور اگلے اجلاس کے لیے پھر کچھ شرکا مختلف موضوعات — مثلاً تفسیر، ادب، سائنس، تاریخ، خلائی تحقیق، ایٹمی تجربات، کمپیوٹر کی ترقیات، سوشلزم اور اسلامی تحریکات — میں سے کچھ موضوعات پر بہترین تازہ کتب کا مطالعہ اپنے ذمے لے لیں۔ صدارت کوئی ایسا ذہین شخص کرے جو جدید علوم و انکشافات اور جدید مدنیات وغیرہ کی کمزوریوں اور تاریکیوں کو بھی واضح کرے اور قرآن کو علوم کی کسوٹی کے طور پر پیش کرے۔

ادبی حلقوں کی مانند سائنس کلب، اقتصادیات کلب، فلاسفی کلب وغیرہ

حلقے بھی کالجوں میں بنائے جاسکتے ہیں۔ (یا بنے ہوئے حلقوں سے کام لیا جاسکتا ہے)

۵۔۔ مختلف موضوعات (دینی، معاشرتی و سیاسی) کے متعلق کانفرنسیں۔ (۱) خالص اپنی ۲۔ اپنے اسٹیج پر کچھ قریب الخیال اصحاب کو بھی مدعو کرنا۔ ۳۔ مشترک انتظامات کے تحت اجتماعات۔

۔۔ سیرت کانفرنسیں (ہر بڑے شہر میں زیادہ سے زیادہ بڑے پیمانے کی)

۔۔ ہجرت کانفرنسیں (فلسفۂ ہجرت اور انبیاء کی ہجرت کے واقعات خصوصاً رسولِ آخرالزماں کی ہجرت کی تفصیلات)۔

۔۔ جہاد کانفرنسیں ۔۔ بنیادی حقوق کانفرنسیں ۔۔ اسلامی جمہوریت کانفرنسیں

۔۔ قرآن کانفرنسیں ۔۔ اجتہاد کانفرنس ۔۔ اہم وقتی مباحث پر کانفرنسیں۔

۔۔ اہم دینی ایام اور شخصیتوں کے متعلق اجلاس (ہال میں، مسجدیں یا شامیانوں کے نیچے) مثلاً یوم بدر، یومِ فتح مکہ، یوم بابِ اسلام، یوم پاکستان۔ (۲۳ مارچ)

شخصیتیں ۔۔ چاروں خلفائے راشدین، حضرت امام حسین، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سیّد احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا محمد علی جوہر، مولانا مودودی، قائداعظم، علامہ اقبال ۔۔ و دیگر بزرگانِ رفتہ۔

۔۔ لٹریری حلقوں کی مدد سے مشاعروں اور بڑے ادبی اجتماعات اور مذاکرات کا انتظام۔

۵۔۔ اگر موقع ملے تو ریڈیو اور ٹیلی وژن سے:۔

تقاریر پیش کرنا۔

ان کے مذاکرات میں مدعو کیا جائے تو شریک ہونا۔ (ہر قسم کے موضوعات ۔ علمی، معاشرتی، اقتصادی، ادبی)۔

ان کے مشاعروں میں حصہ لینا۔

ہ ـــ اپنے منتخب نمائندوں سے تعاون کرنا، ان کے دفاتر سے رابطہ، ان کو عوامی مسائل و شکایات سے آگاہ کرنا، ان کے لیے خاص اجتماعات یا تقاریب منعقد کرنا۔
اجنبی حلقے میں کسی تقریب یا اجتماع کے لیے جانا ہو یا دورہ کرنا ہو تو ایک گروہ کا ساتھ دینا۔

جدید لٹریری و صحافیانہ کام

ہ ـــ وقت کے ابھارے ہوئے بڑے بڑے اہم موضوعات پر نئے سرے سے تحقیق کرکے، نئے اسلوب سے کتابوں کی تیاری۔ منفی طرز سے بڑھ کر مثبت پر زور۔
ہ ـــ عوامی تبلیغی لٹریچر کے سلسلے میں مکالماتی طرز پر ایسا لٹریچر تیار کرنا جس کا پیرایہ آغاز کسی بھی عام قضیتے سے شروع ہو اور پھر آہستہ آہستہ اس کا حل بتایا جائے۔
ہ ـــ اہم مقامات میں اخبارات میں اُٹھنے والی بحثوں سے متعلق مضامین اور مراسلے لکھنے پر دو دو، تین تین افراد کی ٹیمیں مقرر کی جائیں جو ہفتے میں دو بار جمع ہو کر مشورہ کریں اور کوئی سینئر آدمی ان کی رہنمائی کرے۔ تحریریں اسٹریو ٹائپ نہ ہونی چاہئیں جن کی عادت پڑ چکی ہے۔ خاص صورتوں کے علاوہ مخالفت کے جنگی انداز کے بجائے، افہام و تفہیم کا انداز اختیار کیا جائے۔
ہ ـــ ادب کے دائرے میں اب تک جو فوقیت غلط رجحانات کو حاصل رہی ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے، خدا پرستانہ تعمیری ادب کے میدان میں کام کیا جائے، جو کام ہو چکا ہے اسے سامنے لایا جائے اور تحریکی دائروں میں ادب کی اہمیت کا احساس پیدا کیا جائے۔

پارلیمانی گروپ کی ذمہ داریاں

ـــ پارلیمانی دائرے میں بہترین پرفارمنس۔
ہ ـــ بات کرنے کا موقع اپنی ہمت سے خود نکالنا۔ جس کی صورتیں حسب ذیل ہیں۔
کسی چلتی بحث میں حصہ لینا۔ پوائنٹ آف آرڈر اُٹھانا۔ تحریک استحقاق۔

تحریک التوا۔ تجاویز۔

کسی بھی ایسے معاملے میں بات اٹھانے میں پہل کرنا جو پیش نظر ہو اور جس پر حکومت یا کسی اور گروہ کی طرف سے معاملہ اٹھانے کا امکان ہو۔

کوئی دن اور کوئی سیشن اور کوئی بحث اس سے خالی نہ جائے کہ ہمارے لوگوں میں سے ایک یا چند اصحاب نہ بولیں اور اخبارات میں ان کی کارکردگی سامنے نہ آئے۔

۵۔ ضروری معلومات کے ساتھ تیاری

جن موضوعات پر بولنا ہو ان کے متعلق پچھلی سرکاری کارکردگی، عوامی شکایات، سابق سیاسی بیانات اور اعداد و شمار کا مطالعہ کر لینا اور نوٹس فائل میں موجود رکھنا۔

بجٹ سیشن کے لیے بجٹ کے خاص خاص پہلوؤں پر تقاریر کی مخصوص تیاری۔ نیز معاشرے کے مسائل کو مختلف ارکان میں تقسیم کر کے انہیں اپنے اپنے موضوع پر خصوصی تیاری میں مصروف کرنا۔ قواعد کارروائی اور گذشتہ نظائر اور برطانوی، بھارتی پارلیمنٹ کے نظائر پر عبور حاصل کرنا۔ ہو سکے تو آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، امریکہ، فرانس وغیرہ کی پارلیمانی تاریخ پر نظر رکھنا۔

دنیا کی بڑی پارلیمنٹوں کی کارروائی پر کتابیں دیکھنا اور ممتاز پارلیمانی ماہرین کے کاموں کا احاطہ کرنا۔

پارلیمنٹ کے کام کے متوازی پبلک پلیٹ فارم اور پریس سے اس طرح اظہار خیال کرنا کہ ہر طرح کی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو جائے اور باہر کا کام اندر کے کام کو اور اندر کا کام باہر کے کام کو تقویت دے۔

عوامی دائرے میں

۵۔ تمام نمائندوں کو اپنے حلقوں کے عوام کی روایتی تقاریب کے علاوہ ان کی سماجی سرگرمیوں

میں حصہ لینا چاہیے۔

o— ہر نمائندہ اپنے حلقے میں کم از کم ایک (زیادہ بھی ہو سکتے ہیں) دفتر قائم کرے جہاں مقررہ اوقات پر کوئی نہ کوئی ذمہ دار کارکن موجود رہے۔

اس دفتر میں اور اس کے علاوہ دو چار پوائنٹس پر خاص احباب کے ڈرائنگ روموں میں بھی یہ انتظام ہو کر سیشن سے فارغ ہونے کے بعد ہر ہفتے مقررہ دنوں اور اوقات پر "نمائندہ" ان جگہوں پر موجود رہے۔

مقررہ دنوں اور اوقات میں عام باشندے اپنے مسائل اور شکایات لے کے آئیں۔ درخواستیں لائیں۔ جن کا اندراج کیا جائے، ان کے معاملات کی سرسری تحقیق کی جائے، کاغذات وغیرہ دیکھے جائیں، اور پھر جس معاملے میں جو کچھ کرنا ہو، نوٹ کر لیا جائے۔

o— اپنے حلقے میں گشت کرتے ہوئے اور محلے محلے کے افراد کے اجتماعات میں شریک ہوتے ہوئے وہاں کے خاص مسائل — بالخصوص سرکاری محکموں کی طرف سے کسی طرح کی زیادتی یا کسی فرد یا گروہ کی مجرمانہ سرگرمیوں کا خصوصی نوٹس لیا جائے۔

o— صوبے یا ملک میں کسی بھی جگہ کوئی اہم واقعہ رونما ہو، ہمارے نمائندوں میں سے جس کے لیے بھی ممکن ہو ان کو وہاں پہنچنا چاہیے۔ سرکاری کارکنوں اور عوام سے رابطہ کر کے صحیح صورتِ حال معلوم کرنی چاہیے۔ پھر ایسے اُمور کو اہم سرکاری افسروں کے نوٹس میں لانے کے علاوہ ضرورت ہو تو پارلیمنٹ میں بھی اُٹھایا جائے۔ نیز پریس میں بیان بھی دیا جا سکتا ہے۔

o— خصوصیت سے یہ دیکھا جائے کہ کہیں رشوت گیری کا نظام تو موجود نہیں، جگا ٹیکس تو وصول نہیں کیا جاتا۔ جوئے یا بدکاری یا شراب اور ہیروئن کی فراہمی کے اڈے تو نہیں ہیں۔ کوئی ادارہ فحاشی تو نہیں پھیلا رہا۔ مزدوروں یا کسانوں کو مظالم کا سامنا تو نہیں۔

لوگوں کے بہت سے کام ٹیلی فون یا چٹھی کے ذریعے کیے جا سکتے ہیں۔

سرکاری دفاتر اور اداروں میں

○ — وقتاً فوقتاً مختلف سرکاری دفتروں اور اداروں کا معائنہ کیا جائے — جیسے تھانے جیل، تعلیم گاہیں، شناختی کارڈوں کے دفاتر، ریلوے اسٹیشن، ہوائی اڈے وغیرہ۔ مرکزی اور صوبائی ممبران اپنے اپنے دائرۂ کار کا لحاظ رکھیں۔

اِن معائنوں کا ایک مقصد تو عمومی جائزہ ہو، دوسرے یہ کہ اگر کسی سلسلے میں شکایات موصول ہوئی ہوں تو حالات کو بچشمِ خود دیکھ لیا جائے اور ذمہ داروں سے بالمشافہ بات ہو جائے۔

مشاورتی مذاکرات

○ — ہر شہر اور قصبے میں یہ اہتمام کہ مختلف اہم موضوعات پر — مثلاً خارجہ پالیسی، اقتصادی بہبود، صنعت و زراعت یا تجارت، تعلیم، بنیادی حقوق، قانونی مباحث، قومی صحت، بجٹ، ترقیاتی پالیسی، مزدوروں کے مسائل اور خواتین کے امور، جرائم وغیرہ — سے متعلق وکلا، اساتذہ، اقتصادی ماہرین، دانشوروں، اور علماء کو جمع کر کے مذاکرات کرائے جائیں۔ اس طرح مشورے کا حاصل ہوگا، مختلف نقطہ ہائے نظر بھی سامنے آئیں گے اور ربط و اثر کا دائرہ بھی وسیع ہوگا۔

(باقی)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔ (ادارہ)

رسائل و مسائل

نبی اکرمؐ کے بعد خلافت کا استحقاق

جناب عبد المالک صاحب - ناظم شعبۂ استفسارات

سوال: شیعہ و سنی کے مسائل پر جو بحث ہوتی رہی ہے اس سے متاثر ہو کر میرے ایک دوست نے تشیعیت قبول کر لی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے چند سوالات کیے جو بقول اُن کے اگر کوئی صاحب ان کے جوابات دے کر مطمئن کر دیں تو وہ اُسے قبول کر لیں گے۔ سوال تحریر کر رہا ہوں، یا تو براہ راست جواب دیں یا مناسب سمجھیں تو ترجمان میں سوالات بمعہ جوابات کے شائع فرمائیں (مقصد کسی نئے فتنے کا دروازہ کھولنا نہیں ہے)۔

۱۔ حضرت علیؓ کے ہوتے ہوئے دوسرے صاحبان کس طرح خلیفہ قرار پائے۔

۲۔ مشاورت میں علیؓ کے مقابل کس طرح دوسرے صاحبان اپنے آپ کو علیؓ کے ہوتے ہوئے خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔

۳۔ غم غدیر کا خطبہ جس میں رسالتمآبؐ نے حضرت علیؓ کی شان میں یہ فرمایا کہ علیؓ کو مجھ سے ایسی ہی محبت ہے جس طرح موسیٰؑ کو ہارون سے تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اس کے باوجود علی دوسروں کے ہم پلہ قرار دیے جا رہے ہیں۔

۴۔ حضرت عثمان غنیؓ جیسے صاحبوں کے ہوتے ہوئے بھی آل نبیؐ کے گھر میں فقر و فاقہ کیوں ہوا۔

۵۔ اعلیٰ کے ہوتے ہوئے ادنیٰ کی روایات کو کیوں لیا جاتا ہے (جس کی وجہ سے

طریقہ عبادت ہر دو فرقوں میں مختلف ہے؟ یہاں جب میں نے ادنیٰ و اعلیٰ کی تشریح چاہی تو ہمارے دوست نے کہا کہ حدیث کے معاملے میں غلام پر کیوں اعتماد کیا جائے جب کہ حضرت علیؓ کی اولاد وغیرہ سے کیوں نہ پوچھا جائے۔ اسی طرح ایک بحث کے دوران اُن ہی صاحب نے مولانا مرحوم پر ایک بہتان لگایا کہ مولاناؒ نے حضرت عثمانؓ کے بارے میں گستاخانہ الفاظ تحریر فرمائے (خاکم بدہن) حوالہ خلافت و ملوکیت کا دیا۔ لیکن وہ اپنی بات ثابت نہیں کر سکے۔

مجھے آپ کی علمی مصروفیات کا بھی شدت سے احساس ہے لیکن جناب سے انتہائی ادب سے التماس کرتا ہوں کہ ان سوالات کے جوابات مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔ احباب کو سلام کہیے۔

جواب:- حضرت علیؓ کے بجائے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کو کیوں خلیفہ بنایا گیا؟ کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے خلیفہ بنانا تھا انہوں نے ان لوگوں کو خلیفہ بنا دیا اُن کے ساتھ تعاون کیا اور اس طرح انہوں نے اپنا دور گزار لیا۔ یہ سوال کسی کو کرنا تھا یا اس سوال کی ضرورت تھی تو آج نہیں، بلکہ اس وقت تھی تاکہ غلطی کی صورت میں اس کا ازالہ ہوتا اور لوگ مذکورہ حضرات کے بجائے کسی اور کو ان کی جگہ منتخب کر لیتے لیکن اس وقت تو یہ سوال نہ اُٹھایا گیا۔ حضرت علیؓ نے بھی عوام کے سامنے یہ مسئلہ نہیں رکھا اور نہیں کہا کہ اُن سے غلطی ہوئی ہے بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایسی متفق علیہ خلافتیں یا حکومتیں شاید ہی کبھی وجود میں آئی ہوں۔ اب یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ اس دور کے لوگوں جن کے سامنے خلفاء ثلاثہ اور حضرت علی موجود تھے جو انہیں ہم سے زیادہ جانتے تھے اور اس بات کے زیادہ ضرورت مند بھی کہ انہیں اچھے حکمران ملیں کو غلطی لگ گئی اور انہوں نے صحیح انتخاب نہیں کیا تھا۔ اگر بالفرض انہوں نے صحیح انتخاب نہیں بھی کیا تو اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ نقصان جو بھی تھا انہیں کا تھا۔ جب رعیت خود ایسے حکمرانوں پر راضی ہو تو کسی دوسرے کو اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے کیا وہ ان لوگوں کا خود ان سے زیادہ خیر خواہ ہونے کا مدعی ہے اور ان سے زیادہ ان کے حکمرانوں کے متعلق معلومات رکھتا ہے۔ ان دونوں دعووں کو کوئی بھی ذی عقل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس کی

بہ نسبت یہ بات زیادہ معقول ہوگی کہ بعد میں آنے والے اپنے دور کی فکر کریں اور ان مرحومین کی فکر میں نہ گھلیں جن کو اب ان کی فکرمندی کا نہ تو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی ان کی فکرمندی کا فریضہ انہیں سپرد کیا گیا ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ لوگ تو خلفائے ثلاثہ کی خلافت پر راضی نہ تھے لیکن یہ حضرات قوت کے بل بوتے پر مسلط ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ اولاً تاریخ اس کی تردید کرتی ہے۔ ثانیاً اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو ان خلافتوں کے خلاف بغاوت ہوتی اور نہیں تو کم از کم حضرت علیؓ جو بقول شیعہ خلیفہ بلافصل تھے۔ وہی ناحق خلفا کے خلاف میدان میں نکلتے بلکہ جب اس کا موقع آیا اور حضرت علیؓ کی برحق خلافت (جو خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے بعد انہیں ملی اور انہی لوگوں نے انہیں خلیفہ منتخب کیا جنہوں نے خلفائے ثلاثہ کو خلیفہ منتخب کیا تھا) کو امیر معاویہؓ نے چیلنج کیا تو وہ ان کے خلاف میدان میں نکلے اور دو مشہور جنگیں برپا ہوئیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں دونوں طرف سے مسلمان مارے گئے۔ اگر خلفائے ثلاثہ کی خلافتیں حضرت علیؓ کے لیے چیلنج ہوتیں اور ان خلافتوں نے حضرت علیؓ کی خلافتِ بلافصل غصب کی ہوتی تو حضرت علیؓ ان کے خلاف میدان میں نکلتے۔ اگر غاصبین کے خلاف نکلنا ضروری تھا تو پھر خلفاء ثلاثہ کے خلاف خروج کیوں نہ کیا۔ اور نکلنا ضروری نہیں تھا تو امیر معاویہ کے خلاف خروج کیوں کیا۔ اس سوال کا یہ جواب اس وقت ہے جب شیعہ حضرات خلافت کو ایک انتخابی منصب قرار دیں۔ اور امتِ مسلمہ کے لیے یہ حق تسلیم کریں کہ وہ جسے اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہے مقرر کر سکتی ہے جیسے کہ اہل السنت والجماعۃ کا یہی نظریہ ہے۔ اور قرآن پاک، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور تاریخِ اسلام سے اسی نظریۂ خلافت کی تائید ہوتی ہے۔

قرآنِ پاک صاف اور صریح الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی فرد کو اپنا نائب مقرر نہیں کیا بلکہ پوری امت آپ کی نائب ہے۔

وکذلک جعلنٰکم امۃً وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شہیدا۔

"اور اس طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو امت وسط (اعلیٰ امت) بنایا ہے تاکہ تم دنیا بھر کے انسانوں پر حق کے گواہ بنو اور رسولؐ تم پر گواہ بنے۔"

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ"

"اب تم وہ بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔"

"وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً"

"اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں اسی طرح خلافت دے گا جس طرح اس نے اُن سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی اور وہ ان کے لیے اُس کے پسند کردہ دین کی بنیادوں کو مضبوط کر دے گا اور ان کی حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا وہ میری بندگی کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے"۔

جب خلافت اور جانشینی اُمت کے لیے ہے اس کے کسی فرد کے لیے نہیں تو اس سے خودبخود یہ لازم آتا ہے کہ اُمت اپنی خلافت چلانے کے لیے اپنے میں سے کسی فرد کا انتخاب کرے۔ وہ فرد جو اس طرح سے منتخب ہو کر آگے آئے گا وہ برحق خلیفہ ہو گا اور جو خودبخود لوگوں پر مسلط ہو جائے وہ خلیفہ نہیں بلکہ اُمت کے حقِ خلافت کو غصب کرنے والا ہو گا اور وہ اس بات کا اہل نہیں ہو گا کہ اُسے خلیفۃ المسلمین کہا جائے بلکہ وہ ملک اور بادشاہ قرار پائے گا۔ خلفائے ثلاثہ اور حضرت علیؓ اور حضرت حسن رضوان اللہ علیہم اجمعین چونکہ منتخب تھے اس لیے یہ سب خلفائے راشدین کہلائے اور بنو امیہ، بنو عباس اور بنو عثمان منتخب نہ تھے اس لیے بادشاہ کہلائے اور اُن کا دور دورِ ملوکیت کہلایا۔

یہ نظریۂ خلافت حکومت کے ہم معنی ہے یعنی مسلمان اسلام کی بنیاد پر دوسرے

لوگوں سے علیحدہ قوم ہیں ان کا اپنا معاشرہ، اپنی سوسائٹی، اپنی حکومت اور اپنا نظام ہے، لہٰذا ایک معاشرہ جس کی ضرورت حکومت ہے اسے مسلمان خود قائم کریں۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ایسی ہی خلافت کا وعدہ کیا ہے جس میں ایسی حکومت ہو جو دین کو اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرے۔ امن و امان قائم کرے اور خود بھی اسے دشمن کا ڈر نہ رہے اور وہ اللہ کی بندگی کرنے والی اور شرک و کفر سے محفوظ ہو۔

لیکن شیعہ اس طرح کی خلافت کے قائل نہیں ان کے نزدیک اصل خلیفہ اُمتِ مسلمہ نہیں، بلکہ حضرت علیؓ اور بارہ ائمہ معصومین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خلیفہ بنایا ہے اس لیے اُمت کا کام خلیفہ منتخب کرنا نہیں بلکہ اللہ کے منتخب کردہ خلیفہ کو ماننا ہے۔

شیعہ حضرات نے یہ نظریہ اس لیے اختراع کیا ہے کہ پہلے نظریہ کے مطابق وہ خلفاء ثلاثہؓ کی خلافت پر اعتراض نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ اس کے مطابق امت کو خلیفہ منتخب کرنے کا حق تھا اور اس نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے خلفاء ثلاثہ کو منتخب کیا اور چوتھے نمبر پر حضرت علیؓ کو بھی منتخب کیا اور تاریخ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ یہ خلافتیں عوام کی رضا مندی سے قائم ہوئیں اور رضا مندی سے چلیں اور تمام مسلمانوں نے اہل بیت سمیت ان سے تعاون کیا اس لیے مجبوراً شیعہ حضرات نے یہ نظریہ نکالا کہ "خلافت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ اور ائمہ معصومین کو خلیفہ بنایا تھا لیکن مسلمانوں نے اللہ کے فیصلے کے بجائے اپنا فیصلہ نافذ کیا اور اللہ کے مقرر کردہ خلفاء کو مسترد کر دیا۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے جو خلافت دی تھی وہ قائم نہ ہو سکی اس طرح اللہ تعالیٰ نے جس خلافت کا "وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت" کے الفاظ سے وعدہ کیا تھا وہ وجود میں نہ آ سکی۔

شیعہ حضرات کا یہ نظریہ اوّلاً تو ان مذکورہ آیات کے خلاف ہے۔ ثانیاً جس خلافت کی مسلمانوں کو ضرورت تھی (خلافت یا اقتدار) شیعہ نظریہ کے مطابق وہ ضرورت ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ ثالثاً پوری اُمت مسلمہ اہلِ بیت سمیت اس نظریہ کی رُو سے خدا کی باغی بن جاتی ہے۔ رابعاً یہ نظریہ درست ہوتا تو حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اپنے دور

ہیں اُمت سے یہ کہنے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خلیفہ بنایا ہے اس لیے اُمت کو خلافت کے مسئلہ پر غور و فکر کرنے اور مشاورت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ خدا کی طرف سے تقرری کی علامتوں کو جاننے کی ہے۔ اور یہ ہیں وہ علامات جن کی بنا پر ہم خلافت کے قائل ہیں۔ لیکن شیعہ سنی لٹریچر اس بات پر متفق ہے کہ حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہؓ نے اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ شیعہ سنی روایات سے ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے آپ کو خلیفہ بنانے کی کوشش کی تو آپ نے فرمایا کہ یہ کام مہاجرین اور انصار جو اہل حل و عقد ہیں جنہوں نے ابوبکرؓ و عمرؓ کو خلیفہ بنایا تھا کی صوابدید پر ہے وہ جسے خلیفہ بنائیں وہی خلیفہ ہوگا۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں "ان ھذا امرکم لیس لاحد فیہ حق الا ان امرتم" یہ تمہارا کام ہے اس میں کسی کا کوئی حق نہیں اِلّا یہ کہ تم اسے امیر بنا دو" تاریخ طبری ۵/ص ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷)۔ خامساً اس طرح کی خلافت جو بلا اقتدار ہو اس وعدے کا مصداق نہیں بنتی جس طرح کی خلافت کا اللہ نے وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ایسی خلافت کا وعدہ کیا ہے جو با اقتدار ہو جس کا وجود شیعہ نظریہ کے مطابق ابھی تک نہیں ہوا۔ اگر حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے بعد خلیفہ بنے ہیں تو اُن کی یہ خلافت مسلمانوں کے انتخاب سے قائم ہوئی ہے اللہ کی طرف سے تقرری کی بنا پر نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے (شیعہ مذہب کے مطابق) حضرت علیؓ کا خلافت پر تقرر پہلے سے تھا اس بنیاد پر انہیں خلیفہ بنایا گیا ہوتا تو شروع سے انہیں خلافت مل گئی ہوتی یا وہ اس بنیاد پر خلافت کا دعویٰ کرتے لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا سو نہ تاریخ میں حضرت علیؓ کی خلافت کے بارے میں تواتر سے تصریح ہوتی کہ انہوں نے اللہ کی طرف سے تقرری کا دعویٰ کیا اور لوگوں نے اس بنا پر ان کی خلافت تسلیم کی اور اگر خلافت بلا اقتدار پر ان حضرات کو فائز کیا گیا تھا نہ کہ خلافت با اقتدار پر تو پھر یہ ایک روحانی اور علمی قسم کی خلافت ہوئی جیسے کہ شیعہ علماء نے لکھا ہے تو ایسی صورت میں یہ سوال لغو ہو جاتا ہے کہ ان کے بجائے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو کیوں خلافت دی گئی اس لیے کہ انہیں جو خلافت دی گئی وہ خلافت بمعنی حکومت کے ہے اور یہ خلافت حضرت علیؓ کے پاس نہ تھی جسے چھینا گیا ہو ان کے پاس تو روحانی اور علمی خلافت تھی (بقول شیعہ) اور یہ چھیننے کی چیز نہیں ہے۔ پھر یہ بھی

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حضرت علیؓ کو روحانی اور علمی فیض پہنچانے سے روکا گیا تھا اور ان پر اس میدان میں کوئی پابندی لگادی گئی تھی۔ اس کے برعکس اس سلسلے میں حضرت علیؓ سے مشورے ہوتے تھے اور ان کی قدر کی جاتی تھی۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ہے تو یہ روحانی اور علمی خلافت لیکن لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اس کی معرفت حاصل کریں اور حکومت انہیں سپرد کریں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے نفع کے بجائے نقصان ہے کہ امت کو ہمیشہ کے لیے خلیفہ کی پہچان کی آزمائش سے دوچار کر دیا جائے اور ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے بجائے اس مشکل میں ڈال دیا جائے تاکہ وہ کبھی بھی اس میں کامیاب نہ ہوں جیسے اس نظریہ کے مطابق امت ہمیشہ سے اب تک اس میں ناکام ہے اور اپنی ضرورت دوسرے طریقوں سے پورا کر رہی ہے۔ اس لیے حکومت کے بغیر تو گزارہ نہیں گویا خدا کی دی ہوئی خلافت تو بے کار گئی اور کام اس کی بجائے دوسری طرح کی حکومت سے چلایا گیا۔ اس طرح تو یہ خلافت رحمت کی جگہ زحمت بن گئی کہ کام بھی نہ آئی اور امت اس کی معرفت میں ناکام ہو کر گنہ گار بھی ہو گئی۔ اس طرح کی خلافت تو نبوت کی طرح کی آزمائش ہے۔ اگر ایسی خلافت جاری کرنی تھی تو اس کی بجائے سلسلہ نبوت ہی جاری کر دیا جاتا۔

۲۔ آپ کے دوست کی دوسری بات کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ وانت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی" سے حضرت علیؓ کی خلافت ثابت ہوتی ہے درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو غزوہ تبوک کے موقع پر مدینہ میں نائب بنا کر چھوڑ گئے تھے لیکن منافقین جو بلا عذر پیچھے رہ گئے تھے انہوں نے حضرت علیؓ کو بھی اپنے زمرہ میں شامل کرتے ہوئے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ وہ بھی بلا عذر پیچھے رہ گئے تھے۔ اس طرح ان منافقین نے حضرت علیؓ کے اخلاص ایمان کو مشکوک بنانے کی کوشش کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رد میں فرمایا کہ جو مجھ سے دوستی کا دعویٰ کرتا ہے وہ حضرت علیؓ سے بھی دوستی کرے اس لیے کہ وہ مخلص مومن ہیں اور اہل ایمان ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں "والمومنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض (القرآن)" اور میرا اُسے وقتی طور پر مدینہ میں اپنا نائب بنا کر چھوڑنے سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مستقل خلیفہ ہیں اس لیے

کہ مستقل اور نامزد خلیفہ تو نبی ہو سکتا ہے اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ جب نبوت کا دروازہ بند ہو جائے تو افراد کی بجائے اُمت خلیفہ ہوتی ہے۔" اس روایت سے تو الٹا یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی خلیفہ نہیں ہوں گے اس لیے کہ فرد کی خلافت کا سلسلہ بایں معنی کہ اللہ اسے نامزد کرے ختم نبوت کے ساتھ ختم ہو گیا۔

۳ — آپ کے دوست کا تیسرا سوال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر چولہا نہیں جلتا تھا اور آسودہ حال تھے حضرت عثمانؓ لاکھوں کے مالک تھے، کا مختصر جواب یہ ہے کہ آپ کا فقر اختیاری تھا۔ آپ کے پاس حضرت عثمانؓ اور دیگر اصحاب اپنا مال لاتے تھے لیکن آپ اسے اپنے اُوپر خرچ کرنے کے بجائے فی سبیل اللہ خرچ کر دیتے تھے اور آپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دوسرے صاحبِ مال لوگ بھی اپنا مال فی سبیل اللہ قربان کرتے تھے۔

۴ — چوتھا سوال کہ اعلیٰ کی بجائے ادنیٰ کی روایت کیوں لیتے ہیں تو اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ اہل سنت والجماعۃ خلافت و امامت کے مسئلے میں اعلیٰ کی روایات بلکہ متواتر روایات کو بنیاد بناتے ہیں (مثال کے طور پر حضرت علیؓ کی روایات ہم نقل کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے دوست اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق نسب اور نسل کی بنیاد پر کرتے ہیں تو یہ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے" اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" لا فضل لعربی علی عجمی" اور اگر نیکی میں اعلیٰ اور ادنیٰ ہونا مراد ہو تو اس لحاظ سے اہلِ سنت اعلیٰ کی روایت لیتے ہیں اور ان کے نزدیک سارے صحابہ اعلیٰ ہیں اور اس لیے ان سب کی روایات مقبول ہیں۔

آخر میں گذارش ہے کہ آپ کے دوست کے غور و فکر کے لیے چند اشارات پیش کر دیئے ہیں۔ اگر وہ خالی الذہن ہو کر آخرت میں جواب دہی کے احساس سے ان کی روشنی میں سوچ و بچار کریں گے تو انشاءاللہ انہیں اطمینان ہو جائے گا۔ اللہ کرے وہ مطمئن ہو جائیں اور گوہرِ مقصود کو پا لینے کی سعادت سے سرفراز ہوں۔ آمین۔

مطبوعات

ماہنامہ فیض عشاقِ رسولؐ نمبر	مدیر: قاضی محمد حمید فضلی - بہ اہتمام: ادارہ فیوضاتِ مجددیہ، خانقاہ فضلیہ شیر گڑھ، تحصیل و ضلع مانسہرہ - قیمت: خاص نمبر ۱۵/- روپے

ہر دینی ادارے سے مجھے ایک محبت ہے اور پھر کسی کی طرف سے خدمتِ دین کا کوئی بھی کام کیا جائے تو دل میں مسرت کی لہر اٹھتی ہے۔ مگر کسی کام کے متعلق جب یہ تاثر ملے کہ اس میں فرقہ وارانہ رسہ کشی کا اسلوب ہے یا وہ کام آج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دین کے قریب لانے کے بجائے دور دھکیل دے گا تو جذبوں پر اوس سی پڑ جاتی ہے۔

ادارۂ فیوضاتِ مجددیہ کا وجود مبارک، ماہنامہ فیض اور اس کے خاص نمبر کی اشاعت مبارک! اس میں سرکارِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جتنی باتیں حقائقِ ثابتہ کے درجے میں لکھی گئی ہیں وہ بھی مبارک۔ مگر زبان اور اندازِ بیان، حضورؐ کی تخلیق اور آپؐ کے معجزاتی مرتبے کے سلسلے میں (یہ مرتبہ برحق) صوفیانہ پُراسراریت، کمزور روایات کے سہارے قائم ہے۔ اس کا اثر عملی زندگیوں کی اصلاح اور معاشرے کی تطہیر کے سلسلے میں معتد بہ نہیں پڑتا۔ مستند حقائق، سرسری قسم کی روایات اور صوفیانہ اور واعظانہ نکات کے ساتھ ترکیب یافتہ ہیں۔ سلسلۂ نبوت کا سارا تعلق خدا کے اس ابتدائی فرمان سے ہے کہ فاما یاتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضورؐ تک سارے انبیاء خدا کا پیغامِ حق اور ضابطۂ ہدایت لے کر آئے اور سب کو اللہ تعالیٰ نے اسوہ و مطاع قرار دیا۔ یہ ہے سب سے بڑی حقیقت! رسول اور نبی کے بجائے حبیب اور محبوب کے الفاظ استعمال کرنے سے پیغمبر کی نہ داعیانہ حیثیت سامنے آتی ہے، نہ مطاع ہونے کا مرتبہ نمایاں ہوتا ہے۔ وہاں ایسی محبت درکار ہے جس کا نتیجہ اطاعت و اتباع ہو، نہ یہ کہ بجائے خود جنونِ عشق ہی شریعت بن جائے۔

ادارۂ تبیعن اگر حضرت مجدد کو معیار کے طور پر سامنے رکھے تو کوئی الجھن نہ رہے گی۔

وقت کے معزز و محترم علما سے نہایت درجہ نیازمندی کے ساتھ میری گزارش یہ ہے کہ وہ فتنہ ہائے دوراں، نفسیاتِ نوجوانان، اصطلاحاتِ رائجہ اور دقت کے ذوقِ مطالعہ و تصنیف کو اچھی طرح سمجھ کر کام کو آگے بڑھائیں۔ محض اپنی افتادِ طبع کے مطابق اپنا جی خوش کر لینا اصل مطلوب نہ ہو، اصل مطلوب دوسروں کو، خصوصاً جدید دور کے نوجوانوں کو متاثر کرنا ہو۔

میں نے یہ خیر خواہانہ باتیں بڑے اخلاص سے لکھی ہیں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ ادارۂ فیض کو پہلے جو بدگمانی اور رنجش مجھ سے ہوئی ہے وہ مٹ جائے اور چھوٹے مرتبے کے ایک آدمی کی دردمندانہ گذاشات قابلِ غور قرار پائیں۔ یقین رکھیں کہ میرے اندر عناد اور گستاخی کا کوئی رجحان موجود نہیں ہے۔

عربی نگارشاتِ عالیہ | تالیف و ترجمہ الشیخ نذیر حسین۔ ناشر: المنار بک سنٹر، ملتان روڈ منصورہ لاہور (یکے از مطبوعات مرکز معارف اسلامی، منصورہ، لاہور)۔ ضخامت: ۳۴۴ صفحات۔ سفید کاغذ پر اچھی طباعت اور آرٹ کارڈ کا سہ رنگا سرورق۔ قیمت درج نہیں۔

عربی جیسی اعلیٰ زبان سے بہترین نگارشات کا انتخاب کر کے ان کا سلیس ادبی اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے اور اس انتخاب میں الہامی ادب پارے بھی، انسانی کاوشوں کے ساتھ شامل ہیں۔ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ: "شیخ صاحب کا حسنِ نظر اور حسنِ انتخاب قابلِ داد ہے" — "وہ عربی اور اردو دونوں زبانوں کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں" — "یہ منتخب تحریریں دینی اور اخلاقی لحاظ سے نہ صرف سبق آموز ہیں بلکہ عبرت خیز بھی" ہم اس سے بڑھ کر کیا کہہ سکتے ہیں۔ خصوصی اہمیت اس مقصد کو حاصل ہے جسے شیخ صاحب نے خود بیان کیا ہے کہ یہ منتخب نگارشات "ہماری قومی روایات کی حامل، ہماری ثقافتی اقدار کی آئینہ دار اور عوامی زندگی کی ترجمان ہوں"۔

ہر چند کہ میں نے پوری کتاب کو حاصل ہوتے ہی اچھی طرح پڑھا ہے، مگر کہنے کی باتیں وہی

ہیں جو اُوپر آگئی ہیں، اس سے زیادہ اپنا "قول" لگانا لفاظی ہوگی۔ پڑھے جانے کے لائق جو تھوڑی سی کتابیں چھپتی ہیں۔ یہ ان میں سے ایک ہے۔

پیش لفظ دیباچے اور فہرستِ مآخذ کے علاوہ ایک سو ایک منتخب تحریریں اس میں شامل ہیں، جن میں ایمان و اخلاق، اسلامی معاشرت، تاریخ و سیاست اور ادب و ثقافت کی قدریں جھلک رہی ہیں۔ ہمیں شیخ نذیر حسین صاحب سے قوی اُمید ہے کہ وہ اِس کتاب کا اگلا حصہ بھی جلد پیش کر دیں گے۔

معرکۂ سنّت و بدعت تالیف: محمد اشفاق حسین ناظم مجلسِ احیائے توحید و سنّت حیدر آباد (انڈیا)، ناشر: مجلسِ احیائے توحید و سنت۔ ملنے کے پتوں میں سے ایک: مؤلف سے پتہ ذیل پر طلب کریں، الادہ بی بی۔ حیدر آباد (اے پی) ۲۳۔ انڈیا۔ صفحات: ۳۲۰۔ قیمت: ۵/- روپے

یہ کتاب مجھے خاصی اہم معلوم ہوئی۔ اس میں ایک تو سنّت اور اس کے بالمقابل بدعت کی حتمی تعریف مستند حوالوں اور دلائل سے سامنے آتی ہے۔ دوسرے سنت و بدعت کے سلسلے میں سلف اور حال کے ۲۵ معروف علما کے ارشادات پیش کیے گئے ہیں۔ پھر "بدعتِ حسنہ" کی اصطلاح سے پیدا ہونے والے مغالطوں کا ازالہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بدعات کی بہت سی ایسی مثالوں کا تذکرہ ہے جن کا تذکرہ محدثین اور فقہا کی کتابوں میں ہے اور ان پر توجہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کس طرح ہر قسم کے مروجات کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں اور حقیقت کا کچھ پتہ نہیں۔

اپنے دین کو خدا کے لیے خالص اور نبی کی سنّت کے مطابق بنانے میں اِس کتاب سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

اشاعت کے لیے خاص اُردو رسائل مرتبہ حکیم نعیم الدین زبیری۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی ۱۸۔ صفحات: ۲۷۰، طباعتی معیار پسندیدہ، مجلد مع رنگین گرد پوش قیمت: ۴۵/- روپے

ہمدرد لائبریری اچھی بڑی لائبریری ہے۔ اس میں ۵۰ ہزار مطبوعہ کتب، علاوہ ازیں مخطوطات، پھر پانچ سو عنوانات کے تحت پاکستان کے اہم اخبارات کے جمع کردہ تراشے، دس ہزار کے قریب تصاویر،

ڈاک کے ٹکٹ اور اہم رسائل موجود ہیں۔ ایک شعبہ قرآن حکیم کے تراجم کا ہے، ساتھ ہی طبی موضوعات پر لٹریچر جمع کیا جا رہا ہے۔

پیشِ نظر کتاب کتب خانۂ ہمدرد کی ایک توضیحی فہرست ہے۔ کام یہ کیا گیا ہے کہ اردو کے بیشتر اہم رسائل کے تمام خاص نمبروں کے مندرجات کا مع مضمون نگار ان کے تعارف کرایا گیا ہے۔ ذہانت اور وسائل دونوں یک جا ہو جائیں تو کام کرنے والے نئی راہیں نکال لیتے ہیں۔ ہمدرد فاؤنڈیشن اور ہمدرد سنٹر کے تحت جو مختلف کام ہو رہے ہیں ان کے پیچھے حکیم محمد سعید صاحب کا تخلیقی ذہن کارفرما ہے۔ وہ نئی منزلیں سامنے رکھ کر جادہ ملے تو خود پیدا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں اردو رسائل کے خاص نمبروں کا جو خاکہ دیا گیا ہے۔ وہ ہماری دینی، علمی، ادبی اور تہذیبی تاریخ کے ابواب کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہاں جناب مسعود احمد برکاتی صاحب کے لکھے ہوئے حرفِ اول کی دو سطریں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں: "مغربی دنیا ہو یا اسلامی دنیا، دینی تحریکیں ہوں یا سماجی رجحانات، سائنسی پیش رفت ہو یا ایجاد و اختراع کی اطلاعات، امن و صلح کی تدبیریں ہوں یا تصادم اور محاربات کی زور آزمائیاں، کتابوں سے پہلے رسائل میں منعکس ہوتی ہیں"۔ کیا بات کہی ہے جو اب تک اپنے جی میں نہ آئی تھی۔

ہر چند یہ کتاب عام مطالعہ کی کتاب نہیں ہے مگر دینی، علمی اور ادبی و صحافیانہ کام کرنے والوں کے لیے ایک ایسا جامع انڈکس ہے کہ جو ان کی کاوشوں میں بہت مددگار ہوگا۔

دستِ زرفشاں | از جناب صبا اکبر آبادی۔ ناشر: جنید ختیار، فاروقی جمیل، اے ۳/۹۴ گلشنِ اقبال کراچی۔ خوبصورت مصور طباعت، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت: ۴۵/۰ روپے

کہنے کو یہ رباعیاتِ عمر خیام کا منظوم اردو ترجمہ ہے، مگر جناب صبا نے ایسے گلستان آراستہ کیے ہیں کہ پڑھتے ہوئے عمر خیام فراموش ہو جاتا ہے۔ پہلا ورق پڑھ کر ہی میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ذرا بھی تو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ صبا صاحب کی رباعیات ترجمہ کی تعریف میں داخل ہیں۔ دراصل عمر خیام کی ایک ایک رباعی کو ذہن میں جذب کر کے پھر اسے صبا صاحب نے اردو میں سوچ کر اپنی طرف سے آزادانہ طرز پر لکھا ہے۔ خوبی یہ کہ عمر خیام کے فلسفیانہ اور متصوفانہ خیالات کو ایسی سادہ شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے کہ کسی تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ پھر کمال یہ کہ ۱۷۸ رباعیوں کا ترجمہ

آٹھ دس دن میں کیا گیا ہے اور اردو رباعی کی بحر کی پابندی کے ساتھ۔

کتاب سہ آتشہ یوں ہوگئی کہ ہر صفحے پر عمر خیام کی رباعی کا اردو ترجمہ پیش کرنے کے ساتھ فٹنز جیرالڈ کا انگریزی ترجمہ (۱۸۶۱ء) بھی درج کر دیا گیا ہے۔ چوتھی رنگینی یہ کہ عمر خیام کی رباعیات میں کام کرنے والے شاعرانہ مزاج سے ہم آہنگ کچھ مصوری کے نمونے بھی شامل کتاب ہیں۔ طباعت آرٹ پیپر پر آفسٹ سے ہے اور ہر ورق پر گرد سادہ رنگین حاشیہ ہے۔

یہ مجموعہ اشعار اردو میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

اجمالی تذکرہ

حرمت شراب | الشیخ عثمان بن عبدالقادر الصافی - اردو ترجمہ: ابو عبداللہ ریاض شیخ - پتہ: پاک مسلم اکادمی، ۱۷- اردو بازار لاہور - مفت تقسیم۔

اعمال اور نیت | محمد اکرام قریشی ایم اے - ناشر: احیائے دین لائبریری، مسجد ضلع کچہری سیالکوٹ مفت تقسیم۔

نماز اور روزہ | محمد اکرام قریشی ایم اے - ناشر: احیائے دین لائبریری، مسجد ضلع کچہری سیالکوٹ مفت تقسیم۔

نکات سورۂ فاتحہ | از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم - ناشر: صدیقی ٹرسٹ، نسیم پلازا نشتر روڈ کراچی ۵ ارزاں قیمت: ۵۰/- پیسے

اسلامی تہذیب اور آداب معاشرت | از پروفیسر ابوبکر غزنوی مرحوم - ناشر: احیائے دین لائبریری مسجد ضلع کچہری سیالکوٹ - غالباً مفت تقسیم۔

نورانی قاعدہ (برائے تعلیم قرآن) | از محمد ابوبکر صدیق قاسمی - ملنے کا پتہ قاری محمد عبدالسلام قاسمی گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول ملتان - قیمت: درج نہیں۔

انسان کی نجات و فلاح | از مولانا سید مودودیؒ - ناشر: احیائے دین لائبریری، مسجد ضلع کچہری سیالکوٹ - مفت تقسیم۔

وقت کی قدر کیجیے | از علی اصغر چوہدری - ناشر: ادارہ علم و عمل، نزد شاہ لطیف گیسٹ،

ٹنڈو آدم۔ قیمت برائے تبلیغ ۵/- روپے برائے دس کاپی۔

ہمارے پیارے نبیؐ | از حافظ نذر احمد پرنسپل شبلی کالج لاہور۔ ناشر: احیائے دین لائبریری مسجد ضلع کچہری، سیالکوٹ۔ مفت تقسیم۔

انتخابات اور ہم | از محمد اکرام قریشی۔ ایم اے۔ ناشر: احیائے دین لائبریری، مسجد ضلع کچہری سیالکوٹ غالباً یہ بھی مفت تقسیم۔

چھوٹی قسمیں | از مولانا محمد یوسف قریشی، مہتمم جامعہ اشرفیہ پشاور۔ ناشر: موتمر المولفین جامعہ اشرفیہ پشاور۔ قیمت ایک روپیہ۔

انٹرویو | پرنسپل تعلیم القرآن خط و کتابت اسکول لاہور سے ادارہ اردو ڈائجسٹ نے لیا۔ ملنے کا پتہ۔ تعلیم القرآن خط و کتابت اسکول پوسٹ بکس ۱۷۱۲۔ لاہور ۳۔
